فہرست مضامین

تعارف ۴

حصہ اول

ارتداد اور باطل کی جدید شکل ۶
وقت کے چیلنج کو سمجھنے کی ضرورت

حصہ دوم

سلیقہ انسانیت کا بحران ۱۷
(تجاویز وتدابیر)

حصہ سوم

تصوف اور اسلامی تحریکیں ۱۱۶

حصہ چہارم

سلیقہ انسانیت پیدا ہونے کے سلسلہ میں ۱۲۶
ذکر وفکر کے حلقوں کا کردار

تعارف

سلیقۂ انسانیت کے بحران کے موضوع پر یہ کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہماری کتابوں ’’مادیت کی دلدل اور اس سے بچاؤ کی صورت‘‘ ’’جدید انسان کا داخلی بحران‘‘ جیسی کتابوں کی کڑی ہے۔

سلیقۂ انسانیت کے حوالے سے وقت کا چیلنج ایسا ہے، جس نے انسانیت کی چولیں ہلا دی ہیں، اب دیہات وقصبات ہوں یا شہر، سب مادیت پرستی اورنفس پرستی کے بحران سے دوچار ہیں، عالمی سرمایہ دار کی منصوبہ بندی اور الیکٹرانک میڈیا نے مادیت پرستی کی طوفانی لہروں کو بر وبحر تک پھیلا دیا ہے۔

سلیقۂ انسانیت سے ہماری مراد پاکیزہ زندگی، انسانیت کے شایان شان زندگی اور فطرت سے ہمہ آہنگ زندگی ہے، جس کی دعوت اول روز سے انبیاء کرام دیتے چلے آئے ہیں اور اس کے بعد علمائے ربانی بھی یہی دعوت دیتے رہے ہیں۔

سلیقۂ انسانیت کے بحران سے ہمارا مقصود مادیت پرستی، نفس پرستی اور عقل محض پر مشتمل مادی تہذیب ہے، جس کی دعوت اس وقت مادہ پرست انسان اور عالمی سرمایہ دار دے رہا ہے، سلیقۂ انسانیت کا یہ بحران اس وقت ہمہ جہتی وہمہ گیرنوعیت کا ہے، جس نے عالمی سطح سے لے کر محلّہ اور گھر کی سطح تک سب کا گھیراؤ کر لیا ہے، اس وقت خواہشات اور مادیت کا ایک طوفان ہے، جس میں لوگوں کی بہت بڑی اکثریت بہتی چلی جارہی ہے، فہم وفراست اور معرفت نفس اور معرفت رب کی بات سننے کے لئے کوئی آمادگی موجود نہیں، جب فطرت سلیمہ کے اجزاء مسخ ہوجاتے ہیں تو یہی صورتحال پیدا ہوتی ہے کہ پاکیزہ تہذیب اور انسان سازی کی باتیں افراد پر کارگر ثابت نہیں ہوتی۔

انسانیت کی تاریخ میں شاید ہی کبھی ایسا دور آیا ہو، جس میں خوبصورت اور دلفریب اصطلاحات کے پردے میں خواہشات اور مادیت کی طرف اتنی بلند آہنگی سے دعوت دی جاتی ہو، جو اس دور میں دی جارہی ہے، یہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے، جو انسانیت کے ساتھ ہوا ہے، پاکیزہ تہذیب کے حوالے سے بے حسی کی عمومی فضا ہے، جو اس وقت پیدا ہوگئی ہے۔

موجودہ دور میں جب کہ اسلامیت اور کفر کی کشمکش جاری ہے، یہ غیرجانبدار یا تماشائی بن کر رہنے دور ہرگز نہیں ہے، جس فرد میں بھی ایمان کی معمولی چنگاری بھی موجود ہے، اسے

اپنی طاقت کا پلڑہ اسلام کے حق میں ڈالنا ہوگا اور اگر وہ خود براہ راست دعوتی وعلمی وتربیتی محاذ پر کام کرنے کا صلاحیت کا حامل نہیں تو اسے کم از کم دامے درمے سخنے اس محاذ پر کام کرنے والوں کے ساتھ تعاون کرنا ہوگا، تاکہ جدید نوعیت کے کفر کے مقابلہ کی صورت پیدا ہو سکے اور اسلامیت کا تسلسل قائم رہ سکے۔

جدید باطل سے مقابلہ کے سلسلہ میں دعوتی، تربیتی اور علمی محاذ ایسا ہے، جو غیرمعمولی اہمیت کا حامل ہے، اس محاذ پر کام کے نتیجہ میں ہی ریاست ومعاشرے کو اسلامی فکر سے ہمہ آہنگ افراد کارملیں گے، جو سیاست اور اجتماعی زندگی کے رخ کو اسلامیت کی طرف موڑنے میں اپنی صلاحتیں صرف کرنے اور اپنے حصہ کا بھرپور کردار ادا کرنے کا کارنامہ سرانجام دیں گے۔

موجودہ حالات میں سلیقہ انسانیت کے بحران اور اس سے بچاؤ کے موضوع پر دعوتی وعلمی کام کی سخت ضرورت ہے، یہ کام ہماری دینی ذمہ داریوں میں شامل ہے اور لوگوں کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ کتاب میں اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر دل سوزی سے گفتگو کی گئی ہے۔

کتاب میں ممتاز فلسفی ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کی بعض کتابوں سے کچھ طویل اقتبات بھی پیش کئے گئے ہیں، جس میں ڈاکٹر صاحب نے ارتداد اور باطل کی جدید نوعیت کی ہمہ گیر فکری لہر پر نہایت عالمانہ وفاضلانہ بحث کی ہے۔ اور نظام تعلیم کو اسلام سے ہمہ آہنگ نہ بنانے کے نتائج وانتباہات سے آگاہ کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ جدید نسلوں کی مادی تہذیب کی فکری اور علمی بنیادوں پر تربیت اور ذہن سازی کی وجہ سے بظاہر مسلمان ہونے کے باوجود ہماری یہ جدید نسلیں عملی طور پر ارتداد کی راہ پر گامزن ہیں، جب تک جدید تعلیم کے پیدا کردہ ان اثرات کے خاتمہ کی صورت پیدا نہ ہوگی، ہم مادہ پرستی پر مبنی عالمگیر نظام کے ذہنی غلام افراد ہی پیدا کرتے رہیں گے، جو حق وباطل کی کشمکش میں باطل کا دفاع کرتے رہیں گے اور دور جدید کے باطل کی حمایت ووکالت کا کام سرانجام دیتے رہیں گے۔

اللہ کرے یہ کتاب پڑھنے اور اس پر غوروفکر کرنے کی صورت پیدا ہو، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کو اپنے ہاں قبولیت کا شرف عطا فرمائے۔ (آمین)

محمد موسیٰ بھٹو
حیدرآباد

۴ دسمبر ۲۰۱۸ء

ارتداد اور باطل کی جدید شکل

وقت کے چیلنج کو سمجھنے کی ضرورت

(ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

زیر نظر مضمون میں شامل اقتباسات ڈاکٹر محمد رفیع الدینؒ کی مختلف کتابوں سے لئے گئے ہیں، شروع کے طویل اقتباسات ''قرآن اور علم جدید'' سے ماخوذ ہیں، یہ کتاب پہلی بار ۱۹۵۴ء میں شایع ہوئی تھی، کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے جدید باطل نظریات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھاہے اور ان پر سیرحاصل تنقید کرکے نظریہ ارتقا، نظریہ جنس، نظریہ حیوانی جبلت، نظریہ احساس برتری وغیرہ کے بارے میں قرآن کا تفصیل سے موقف واضح کیا ہے، یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد نوعیت کی کتاب ہے، اس موضوع پر اب تک اس سے بہتر کوئی کتاب سامنے نہ آسکی ہے، ڈاکٹر صاحب نے کتاب کے تعارف میں ارتداد اور کفر کی جدید شکل ونوعیت پر گفتگو کی ہے، اس تحریر کا ایک معمولی اور ابتدائی حصہ ہم یہاں پیش کررہے ہیں، وقت کے چیلنج کو سمجھنے کے سلسلہ میں یہ مضمون غیرمعمولی اہمیت کا حامل ہے۔ **محمد موسیٰ بھٹو**

کُفر کی ہمہ گیریت اور ہماری غفلت

کُفر مغرب کے جدید فلسفیانہ تصورات کے آلات سے مسلح ہو کر اسلام پر حملہ آور ہوچکا ہے اور اس نے مِلت کی صفوں کو درہم برہم کر دیا ہے، دنیا بھر میں ہمارے لاکھوں تعلیم یافتہ بھائی ہم سے چھینے جاچکے ہیں اور دن رات چھینے جارہے ہیں۔ اس صورت حال نے ہماری قومی زندگی کے لئے ایک شدید خطرہ پیدا کردیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم اس خطرہ کی

شدت کا احساس نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی روک تھام کے لئے کوئی مؤثر کارروائی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہایت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس نوعیت اور اس پیمانہ کا فتنۂ ارتداد اسلام کی ساری تاریخ میں کبھی رونما نہیں ہوا، لیکن اس کے باوجود شاید مسلمان کبھی کسی قومی خطرہ سے اس قدر بے پروا نہیں ہوئے جس قدر اس سے بے پروا ہیں۔

مذاہب کے کُفر کے بارے میں ہماری مستعدی

ایک زمانہ وہ تھا، جب ہندوستان میں آریہ دھرم اور عیسائیت ایسے مذاہب نے اسلام کو للکارا تھا۔ اس وقت عیسائی مشنریوں اور دیانندی ہندوؤں کی کوششوں سے ہندوستان بھر میں صرف چند پڑھے لکھے مسلمان عیسائی یا آریہ بنے تھے۔ لیکن ہم نے شورِمحشر بپا کر دیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایسے علماء کی ایک بہت بڑی تعداد سامنے آ گئی تھی، جنہوں نے کتابوں، رسالوں، اخباروں، وعظوں، جلسوں اور مناظروں کے ذریعہ سے مخالفینِ اسلام کی پے درپے مؤثر تردید کی تھی۔ ان علماء نے آریہ دھرم اور عیسائیت کے ماخذ کا بغور مطالعہ کیا اور مطالعہ کے بعد ان پر سنگین اعتراضات وارد کئے اور جو اعتراضات ان کی طرف سے اسلام پر وارد ہوتے تھے، ان کا مسکت جواب مہیا کیا، یہاں تک کہ غیروں کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ مذاہب کی اس جنگ میں اسلام کا پلڑا بھاری رہا ہے، ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ارتداد کا فتنہ رک گیا۔

کفر کی نئی صورت

اب کفر ایک اور لباس میں اسلام کے مقابلہ پر آیا ہے، اس دفعہ اس کا لباس مذہب کا لباس نہیں، بلکہ فلسفہ کا لباس ہے، اس لباس میں وہ اسلام کو ہی نہیں، بلکہ سارے مذاہب کو ملیامیٹ کردینا چاہتا ہے، اس کا یہ خطرناک منصوبہ یہاں تک کامیاب ہے کہ عیسائیت اور آریہ دھرم ایسے وہ مذاہب جو کسی زمانہ میں اسلام کے مقابلہ میں بڑی قوت سے ڈٹے ہوئے تھے، اپنے اس نئے حریف کی تاب نہ لاکر دم توڑ چکے ہیں اور اب اگر اس کے مقابلہ پر کوئی مذہب میدان میں باقی رہ گیا ہے تو وہ فقط اسلام ہے، لیکن اسلام کو بھی اس نے ایسا نقصان عظیم پہنچایا ہے کہ ویدک دھرم اور عیسائیت کے پرستار اس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے، کیونکہ اس نے ان مذاہب کی طرح صرف چند مسلمانوں کو نہیں، بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو مرتد بنایا ہے اور ابھی اس کی فاتحانہ یلغار بڑھ رہی ہے۔

نئے دشمن کے نئے طریقے

اسلام کے خلاف اس کے نئے دشمن یعنی فلسفۂ باطل کی جارحانہ کارروائیاں اس کے پہلے دشمن یعنی مذہب باطل کی جارحانہ کارروائیوں سے بالکل مختلف ہیں!

جدید باطل کا علم وعقل کے نام پر حملہ

مذہب باطل براہِ راست اور بلاواسطہ اسلام کے مقابلہ پر آتا تھا۔ باطل فلسفہ براہِ راست اور بلا واسطہ اسلام کے مقابلہ پر نہیں آتا، علم اورعقل کے نام سے اس کا مقابلہ کرتا ہے، وہ جب اسلام کی تردید کرتا ہے تو اسلام کا نام نہیں لیتا، بلکہ اسلام سے اس طرح قطع نظر کرتا ہے کہ گویا اسے معلوم ہی نہیں کہ اسلام بھی اس کے حریف کی حیثیت سے دنیا میں کہیں موجود ہے اور وہ اسے مٹانے کے لیے میدان میں نکلا ہے، بلکہ وہ علمی تحقیق اورعقلی استدلال کے بل بوتے پر انسان اور کائنات کی ایک ایسی تشریح کرتا ہے، جس میں اللہ اور رسالت اور دین کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ اسلام بھی انسان اور کائنات ہی کا ایک نظریہ ہے۔ مذہب باطل عقیدہ اور سند کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا، بلکہ وہ ان کو علم اورعقل کے معیار پر پرکھتا ہے اور صرف قدرت اور اس کے ناقابل تغیر وتردید قوانین کے نام پر لامذہبیت اور دہریت کی طرف دعوت دیتا ہے۔

باطل فلسفہ کے حملہ کے موقعہ پر غیرت دینی کا فقدان

باطل مذہب جب اسلام کی مخالفت کرتا تھا تو ہماری غیرتِ دینی جوش میں آتی تھی، ہمارا جائز غصہ بھڑکتا تھا، اور ہمارے دل میں اس کی مخالفت اور اس کے مقابلہ میں اسلام کی مدافعت اور محافظت کا جذبہ ابھرتا تھا۔ ہمیں ذرہ بھر شبہ نہیں ہوتا کہ اس کا ماننا اسلام کا انکار ہے اور اس کا اثبات اسلام کی نفی ہے، لیکن باطل فلسفہ جب اسلام کی مخالفت کرتا ہے تو ہماری

غیرت دینی کا جوش کم ہوتا ہے، ہمارا جائز غصہ ٹھنڈا پڑتا ہے اور ہمارے دل میں اس کی جوابی مخالفت اور اس کے مقابلہ میں اسلام کی مدافعت اور حمایت کا جذبہ کمزور ہوتا ہے، جب ہم اس کے فریب میں پھنستے ہیں تو بے عملی اور جہالت قبول کرتے ہیں، لیکن اسے علم کا نام دیتے ہیں اور بے عقلی اور نادانی اختیار کرتے ہیں، لیکن اسے عقل اور زیرکی سمجھتے ہیں، ہم اس کی باتوں کو مانتے ہیں، لیکن ہمارے دل میں یہ بات نہیں کھٹکتی کہ ان کے اثبات سے اسلام کی نفی ہوتی ہے اور اُن کو صحیح ماننے سے اسلام کو غلط قرار دینا لازم آتا ہے، ہم اسے دشمن نہیں، بلکہ دوست سمجھتے ہیں اور اس سے تعاون کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری بربادی کی جن کوششوں میں وہ مصروف ہے، وہ ہمارے ہی ہاتھوں سے زیادہ مؤثر اور زیادہ کامیاب ہوجاتی ہیں۔

آشکار مخالفت

باطل مذہب کے اثر سے جب کوئی مسلمان اسلام کو ترک کرتا تھا تو وہ مجبور ہوتا تھا کہ کسی گرجا یا مندر میں جاکر شدھی یا بپتسمہ کی ایک خاص رسمی کارروائی میں سے گزرے، اس کے بعد وہ مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوجاتا تھا اور ان سے ہرقسم کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات منقطع کر لیتا تھا، اس کی عبادت کی رسمیں اور بودوباش کے طریقے بدل جاتے تھے اور وہ شادی اور بیاہ، دوستی، رشتہ داری اور میل وملاقات کے لیے ایک دوسری قوم سے راہ وربط پیدا کرتا تھا۔ اس تغیر سے اس کا کفر واضح ہوجاتا تھا۔ اسلام سے اس کی دشمنی اورنفرت آشکار ہوجاتی تھی اور مسلمان اسکی طرف سے ہوشیار اور بیدار ہوجاتے تھے۔

کفر کے باوجود مسلمانوں کی صف میں شامل ہونا

لیکن باطل فلسفہ کے اثر سے جب کوئی مسلمان اسلام کو ترک کرتا ہے تو وہ مجبور نہیں ہوتا کہ بپتسمہ یا شدھی کی طرح کی کسی رسمی کارروائی میں سے گزرے یا مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوجائے یا ان سے اپنے سماجی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات منقطع کرے یا اپنی بود وباش کے طریقوں کو بدل دے یا شادی، بیاہ اور دوستی اور رشتہ داری اورمیل ملاقات کے لیے کسی اور قوم سے راہ وربط پیدا کرے،کیونکہ اسلام کے اس نئے ہوشیار دشمن نے اپنے پرستاروں کو اجازت دے رکھی ہے کہ تم مذہب سے بیزار ہو کر اور اللہ اور رسول کے دشمن بن کر رہو تو کوئی حرج نہیں کہ تم پھر اسلام ہی کے دائرہ کے اندر ہو۔ چنانچہ اس دشمن دین وایمان سے رشتہ جوڑنے والے آج نصف سے بھی زیادہ مسلمان ایسے ہیں جو یا تو خدا کے منکر ہیں یا وحی کے یا رسالت کے یا حیات بعد الممات کے یا جزا اور سزا کے اور یا ان سب کے۔

کُفر کی جدید صورتیں

ان مسلمانوں میں سے بعض ایسے ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ اسلام اس زمانہ میں ناقابل عمل ہے اور بعض کا خیال ہے کہ سارا مذہب ہی ایک ڈھکوسلہ ہے جو یا تو اقتصادی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے یا دبی ہوئی جنسی خواہشات کا ردعمل، پھر ان میں سے کوئی اسلام کے معاشی نظام کو فرسودہ اور بیکار سمجھتا ہے، کوئی اسلامی ریاست کی تجویز کو مضحک قرار دیتا ہے، کوئی جنسی تعلقات پر اسلام کی عائد کی ہوئی پابندیوں کو ایک فطری حیاتیاتی عمل کی ناجائز، مضرصحت اور خارج از وقت رکاوٹ سمجھ کر ان کا استخفاف کرتا ہے۔ کوئی اسلام کی عبادت کے طریقوں کو بے معنی سمجھتا ہے، کوئی زکوٰۃ کو موقوف کرنا چاہتا ہے، کوئی حج کو، کوئی قربانی کو، کوئی نماز کو اور کوئی روزہ کو، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اسلام ہی کے نام پر اسلام کے اساسیات کا انکار کرتے ہیں اور اس کے بنیادی اصولوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں، وہ اپنے غیراسلامی تصورات ہی کو اسلام کا نام دیتے ہیں اور اکثر انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اسلام سے الگ ہو چکے ہیں، بلکہ ایک ایسی راہ اختیار کر چکے ہیں، جو اسلام سے بالکل برعکس سمت میں جاتی ہے۔

ان ساری باتوں کے باوجود یہ لوگ مسلمانوں کی جماعت میں مسلمان بن کر رہتے ہیں، اس سے شادی، بیاہ، دوستی اور رشتہ داری، میل وملاقات اور کھانے پینے کے تعلقات قائم رکھتے ہیں، بلکہ ان کے جنازے پڑھتے ہیں۔ ان کی عبادتوں میں شریک ہوتے ہیں اور ان کے سیاسی، قومی اور جماعتی عزائم کے ساتھ زبانی طور پر کلیتہ لیکن دل ہی دل میں اپنی مخصوص

شرائط کے ماتحت ہمدردی رکھتے ہیں۔ (ماخوذ قرآن اور علم جدید)

قرآن اور علم جدید کے علاوہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے اپنی کتاب ''پاکستان کا مستقبل'' میں بھی اہم مباحث کئے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب ۱۹۴۸ء میں لکھی تھی۔ موصوف ۱۹۴۸ء میں ہمیں انتباہ دیتے ہیں کہ اگر ہم نے اسلام سے روگردانی اختیار کی تو ہم مقاصد ارتقا کے لئے بیکار بلکہ مضر سمجھکر نظروں سے گراادیئے جائیں گے، سلطنت ہم سے چھین لی جائے گی اور ہمیں ذلت کی زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا۔

ڈاکٹر کی تحریر کا اقتباس اس طرح ہے۔

''خواہ ہم اسلام سے کتنے ہی روگرداں ہوں اور خواہ یہ بات ہمیں اس وقت کیسی ہی مشکل نظر آئے، لیکن اسلام پھر بھی اس دور کے غلط نظریات پر جو اسے نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں، غالب ہوکر زندہ رہے گا۔ البتہ یہ بات ثابت ہوجائے گی کہ ہم سازگار حالات کے باوجود جو قدرت ہمارے لیے پیدا کر رہی ہے، قدرت کے ارادوں کے ساتھ تعاون کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس صورت میں ہم مقاصدِ ارتقا کے لیے بیکار بلکہ مضر سمجھ کر نظروں سے گرا دیے جائیں گے۔ سلطنت کی نعمت ہم سے چھین لی جائے گی اور ہمیں ذلت کی زندگی بسر کرنے اور آخر کار مٹ جانے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا اور ہماری جگہ کسی اور قوم کو کھڑا کر دیا جائے گا، جو اسلام کی خدمت کرنے اور لوگوں کی ملامت سے بے پرواہ ہو کر زمانہ کے باطل کے ساتھ ٹکر لینے کے لیے تیار ہوگی۔ پھر سلطنت، دولت، علم اور دنیا کی تمام نعمتیں اسی قوم کو دے دی جائیں گی۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ محض میرے تخیل کی پیداوار نہیں، بلکہ قرآن حکیم کی متعدد آیات اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں:

یاایھا الذین آمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم . (۵: ۵۴)

(ترجمہ: مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دین سے منحرف ہوجائے تو اللہ کو اس کی پرواہ نہیں۔ وہ ایسے لوگوں کو پیدا کردے گا جن کو وہ دوست رکھے گا اور وہ اسے دوست رکھیں گے۔ مسلمانوں کے حق میں نرم اور کافروں کے حق میں سخت ہوں گے۔ اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کا باک نہ رکھیں گے)۔

ان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لایکونوا امثالکم . (۳۸ :۴۷)

(ترجمہ: اگر تم اسلام سے منحرف ہوجاؤ تو اللہ تمہیں مٹا کر تمہارے عوض میں اور قوم لائے گا پھر وہ تمہاری طرح نہ ہوں گے)۔ (ایضا صفحہ ۹۵)

بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ پاکستان ایک کمزور اور چھوٹا سا ملک ہے، جو بالخصوص ایٹم بم کے اس زمانہ میں دنیا کی بڑی طاقتوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا، لیکن قوموں کا عروج وزوال نہ تو اس کے ظاہری مادی اسباب پر منحصر ہے اور نہ ان کی قوت سعی وعمل پر، بلکہ اس کا دارومدار کائنات کی باطنی قوتوں کے عمل پر ہے۔ جو قوم بھی ان قوتوں کے نہ رکنے والے عمل کو اپنے موافق اور مطابق کرے گی، وہ زندہ رہے گی اور دوسری قومیں خواہ ان نظریات کے ظاہری اسباب کچھ ہوں، مٹ کر فطرت کی اس چہیتی قوم کے لیے راستہ صاف کردیں گی۔ جس طرح سے ایک فرد کی خودی کے اندر جذبۂ حسن وکمال موجود ہے، اسی طرح سے کائنات کی ساری ارتقائی حرکت اس جذبہ کے اظہار واطمینان کے لیے ہے اور قدرت نے جو انسان میں جذبۂ حسن وکمال رکھا ہے، وہ بھی اسی غرض سے ہے کہ انسان اس کے ساتھ مل کر کام کرے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنے، جو قوم کائنات کے اندرونی جذبۂ حسن وکمال کی موید ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں جو قوم آخرکار کامل نظامِ تصورات کو اپنی زندگی کی حقیقی بنیاد بنائے گی، وہ روئے زمین پر حکومت کرے گی۔ کیونکہ اس کے ظاہری حالات خواہ کیسے ہی مایوس کن ہوں، فطرت اسے عروج وکمال پر پہنچانے کے لیے بیتاب ہے، اگر وہ تہی دست ونادار ہوگی تو دولت دوسروں سے چھین کر اسے دے دی جائے گی۔ اگر اس کے پاس سامانِ جنگ نہ ہوگا تو اسے اجازت دے دی جائے گی کہ دوسروں کا سامانِ جنگ چھین کر اپنے قبضہ میں لے لے۔ اگر وہ بے علم وبے ہنر ہوگی تو اسے علم وہنر سے آراستہ کیا

جائے گا۔ اگر وہ عمل سے محروم ہوگی تو دوسروں کے ہاتھ پاؤں شل کیے جائیں گے اور اسے قوتِ سعی وعمل سے نوازا جائے گا۔ قدرت ان تمام ترقیوں سے جو وہ نوعِ انسانی کو آج تک نصیب کرتی رہی ہے، صرف ایک قوم کی تعمیر کرنا چاہتی ہے اور وہ خاتم النبیین کی امت ہے۔ اگرچہ اس قوم کی تعمیر کے سامان کا بہت سا حصہ اس وقت دوسری قوموں میں بکھرا ہوا ہے، لیکن بالآخر وہ یکجا کرکے اسی قوم کے سپرد کیا جائے گا۔ مسلمان مطمئن رہیں کہ جو کچھ دنیا پیدا کر چکی ہے، وہ ان ہی کا ہے اور جو کچھ دنیا نے ابھی تک پیدا نہیں کیا، وہ خود پیدا کرنے والے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اسلام کو فی الواقع ایک کامل نظام تصورات کی حیثیت سے کام میں لائیں یعنی اسے اپنی سیاسی زندگی کی روح ورواں بنائیں۔'' (پاکستان کا مستقبل صفحہ ۹۹)

مغربی فکر سے مرعوبیت ایسی چیز ہے، جو سلیقہ انسانیت کی آراستگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، چونکہ مغربی فکر کا محور مادیت اور مادی زندگی کے مستقبل کی بہتری پر مبنی ہے، اس لئے مغربی فکر، مادیت کے احساسات وجذبات ہی کو مہمیز دینے کا ذریعہ بن سکتا ہے، اس سے اسلام کو مطلوب سلیقۂ انسانیت اور پاکیزہ انسانی زندگی کا حصول ناممکن ہے، مغربی فکر کی نقالی وتقلید سے بچاؤ اور اسلامی فکر سے مستحکم وابستگی کے موضوع پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے ''اسلام کا نظریہ تعلیم'' کے نام سے اپنی کتاب میں ہمیں بر وقت انتباہ دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب قیام پاکستان کے فوراً بعد لکھی تھی، کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں چھپا ہے۔ وہ دستیاب ہے۔ یہاں اس کے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

''جب ایک قوم ذہنی محاذ پر شکست کھا جاتی ہے تو خواہ اس کی فوجی طاقت کیسی ہی زبردست ہو، وہ فوجی محاذ پر لڑنے کے قابل نہیں رہتی، بلکہ خود بخود ہتھیار ڈال کر دشمن کے ساتھ مل جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی قوم ذہنی محاذ پر اپنے آپ کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں کامیاب ہوجائے تو وہ تھوڑی سی فوج کے ساتھ دشمن کی فوج کو شکست دے لیتی ہے۔ اور اگر دشمن اسے فوجی لحاظ سے مغلوب بھی کرے تو اس کا غلبہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا، اس حقیقت سے پتہ چلتا ہے کہ ذہنی محاذ فوجی محاذ کے مقابلہ میں کس قدر زیادہ اہم ہے، کہا جاتا ہے کہ دشمن پر حملہ کرنے میں پہل کرنا دشمن کے حملہ سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ ہے، یہ اصول جس قدر فوجی محاذ کی صورت میں درست ہے، اس قدر ہی ذہنی محاذ کی صورت میں بھی درست ہے،اس اصول پر عمل کرتے ہوئے ہمارے دشمن مدت سے ہمارے خلاف اپنے تصورات کے حملہ کو شروع کر چکے ہیں۔ اگر ہم اس حملہ کا مؤثر جواب نہ دیں تو ہماری زندگی خطرہ میں رہے گی۔ اپنی قوم کو دوسری قوموں کے غلط تصورات کے تباہ کن اثرات سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم فوراً دوسری قوموں کے خلاف فکری اور عقلی تصورات کے پر امن آلات کے ساتھ جارحانہ کارروائی کا آغاز کریں اور جب تک ہمیں مکمل غلبہ حاصل نہ ہوجائے، اسے متواتر جاری رکھیں، ورنہ ان کے تصورات کا اثر ہمارے اعتقاد اور یقین کو سلب کرتا چلا جائے گا۔ اور ہم ذہنی اور سیاسی لحاظ سے کلیتہً مغلوب ہوجائیں گے۔ (صفحہ ۳۷)

'' ذہنی کار زار میں فی الفور اپنی پوری قوت کے ساتھ اترنے میں پیش قدمی نہ کرنے کا سبب یا تو ہماری لاعلمی ہے کہ ہم جانتے ہی نہیں کہ ہم پر کوئی دشمن حملہ آور ہورہا ہے اور ہمیں اپنی محافظت اور مدافعت کی ضرورت ہے اور یا پھر ہم اس حملہ کے ممکن نقصانات کا اندازہ نہیں کر سکتے اور اپنے آپ کو اس قدر مضبوط اور مستحکم سمجھتے ہیں کہ کسی مدافعت کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔

اس وقت ہماری قوم میں جس قدر اختلافات موجود ہیں،وہ غیر اسلامی نظریات کے اثر کا نتیجہ ہیں، اشتراکیت۔ قومیت پرستی۔نسل پرستی اور صوبہ پرستی کے امراض جس حد تک ہمارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، ان کے پھیلنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلامی تصورات کی محبت سے محروم ہوگئے ہیں،کیونکہ اب تک اس محبت کو تازہ بتازہ جسد ملت کے ہر ایک حصہ تک پہنچاتے رہنے کے لئے ہمارے پاس کوئی نظام تعلیم موجود نہیں تھا اور جس حد تک ہم اسلامی تصورات کی محبت سے محروم ہوئے ہیں، اسی حد تک غیر اسلامی تصورات کی محبت ہمارے دل میں متمکن ہوگئی ہے۔

اگر ہم نے اپنے ملک کے لئے ایک اسلامی نظام تعلیم کی تعمیر میں دیر کی تو ہم اعتقادی اور اخلاقی لحاظ سے دن بدن کمزور ہوتے جائیں گے،کسی قوم کی اعتقادی یا اخلاقی قوت یعنی نصب العین کی محبت اسکی تمام قوتوں کا سرچشمہ ہوتی ہے، اس پر قوم کی وحدت اور تنظیم کا دارو مدار ہوتا ہے اور اسی کی بنیادوں پر قوم کی فوجی اور اقتصادی قوتیں تعمیر پاتی ہیں، اگر نصب العین کی محبت کمزور ہوجائے تو قوم کی ساری قوتیں کمزور ہوجاتی ہیں۔ (صفحہ ۳۸)

'' ہم چاہیں یا نہ چاہیں، لیکن ہم دوسری قوموں کے ساتھ ایک ایسی دوڑ میں شریک ہیں، جس میں ہر قوم نے جان کی بازی لگا رکھی ہے، جو قوم اس دوڑ میں ہار جائے، اسکی سزا یہ ہے کہ اسے مٹادیا جاتا ہے اور جو جیت جائے، اس کا انعام یہ ہے کہ دوسری قومیں اس کی غلام بنادی جاتی ہیں۔ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہم اس دوڑ میں جیت رہے ہیں، یا ہار رہے ہیں، ہر دوڑ کی طرح اس دوڑ میں بھی وقت کا پہلو نہایت اہم ہے،جو قوم وقت ضائع کرے گی، خواہ وہ کیسی ہی طاقتور ہو، ضرور ہار جائیگی۔ اگر ہم نے وقت ضائع کیا تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ دوسروں کے تصورات اور معتقدات کا سیلاب ہمیں گھیرتا چلاجائیگا اور اگر ہم نے عجلت سے کام لیا تو ہم نہ صرف اس سیلاب سے محفوظ رہینگے۔ بلکہ ہمارے اعتقادات وتصورات کا سیلاب دوسروں کو اپنے گھیرے میں لے لیگا۔ افسوس ہے کہ ہم نے ابھی تک اس بات کو پوری طرح سے نہیں سمجھا کہ تعلیم کا معاملہ محض تعلیمی نوعیت کا نہیں، بلکہ سیاسی نوعیت کا ہے اور ہماری زندگی اور موت اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ (اسلام کا نظریہ تعلیم، صفحہ۳۹)

''کسی قوم کی تاریخ میں زندگی اور موت کو پیدا کرنے والے عوامل کے اثرات چند سالوں بلکہ بعض وقت چند صدیوں میں بھی نمودار نہیں ہوتے۔لیکن اس کے باوجود یقینی طور پر نمودار ہوتے ہیں اور ان کا اثر روکا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی قوم زندہ ہورہی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ دنیا اس کی زندگی اور طاقت کا مشاہدہ آج کرے یا چند صدیوں کے بعد۔ دنیا ضرور اس کی زندگی اور طاقت کا مشاہدہ کرے گی۔ اسی طرح سے اگر کوئی قوم مرر ہی ہے تو یہ معمولی بات ہے کہ لوگ اسکی موت کا نظارہ آج دیکھیں یا کچھ عرصہ کے بعد اس کی موت لامحالہ دنیا کے سامنے آجائیگی۔ہمیں دیکھنا چاہئیے کہ ہم مررہے ہیں یا زندہ ہورہے ہیں۔ دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا ہم اپنے اعتقادات کی حفاظت نہ کرنے سے ذہنی طور پر دوسروں کے غلام بن جائیں گے اور پھر ہماری سیاسی آزادی بھی خطرہ میں پڑجائے گی اور یا پھر ہم اپنے معتقدات سے دوسروں کو ذہنی طور پر مغلوب کرکے،ان کی سیاست پر غالب آجائیں گے، موت اور زندگی اور غلامی اور آزادی کی راہوں کے درمیاں دنیا کی کسی قوم کے لئے کوئی مقام نہیں، ہمیں دیکھنا چاہئیے کہ ہمارا رخ کس طرف ہے۔ ذہنی آزادی کی طرف یا ذہنی غلامی کی طرف، زندگی کی طرف یا موت کی طرف؟ اگر اب بھی ہم اپنے نظام تعلیم کو بدل کر اپنے نظریۂ زندگی کے مطابق نہیں بناسکے تو ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نہایت ہی دلخراش اور اندوہناک ہے۔ (صفحہ ۳۹)

'' اسی طرح سے ہر قوم کی شکست ذہنی شکست ہے اور فتح ذہنی فتح ہے، کوئی قوم فوجی شکست سے اس وقت تک پریشان نہیں ہوتی، جب تک کہ اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نتیجہ ذہنی شکست ہوگا اور کوئی قوم فوجی فتح سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتی، جب تک کہ اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نتیجہ ذہنی فتح ہوگا۔لیکن قوموں کی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے فوجی شکست ہمیشہ ذہنی شکست پر اور فوجی فتح ہمیشہ ذہنی فتح پر ختم ہوتی ہے۔ (صفحہ۴۰)

سلیقہ انسانیت کا بحران

اور بچاؤ کی تدابیر

(۱) عہد جدید میں سلیقۂ انسانیت کا ہمہ گیر بحران پیدا ہونے کا ایک بڑا محرک یہ ہے کہ اہل مغرب جن کے ہاتھوں میں دنیا کی سیادت وقیادت ہے، وہ انسان، کائنات اور تخلیق کائنات کے بارے میں مادی نقطہ نگاہ کے حامل وعلمبردار ہیں اور اپنے سیاسی تفوق وبرتری سے انہوں نے اس مادی فکر کو دنیا بھر میں پھیلا کر انسانیت کو دین ومذہب کے عقائد اور اس کی بنیادی اقدار سے دور کرنے کی کوششیں کیں اور اس کوشش میں وہ قابل ذکر حد تک کامیاب ہوگئے ہیں، اللہ، مذہب، وحی ورسالت کے بغیر قومی اخلاق اور کاروباری اخلاق تو پیدا ہوسکتا ہے اور محدود دائرہ میں انسانی حقوق کی صلاحیت بھی پیدا ہوسکتی ہے۔لیکن اس سے معیشت ومعاشرت اور اجتماعی زندگی میں صحیح رہنمائی حاصل ہو سکے اور وہ درست ہوسکے، ذ ہنی، وجدانی اور روحانی طمانیت حاصل ہو سکے، پاکیزہ اخلاقی قدروں سے بہرہ وری ہوسکے، ممکن نہیں، مغرب نے انسان، کائنات اور تخلیق کائنات کے اپنے مادی نظریہ کو اپنے سیاسی تفوق کی بدولت پوری انسانیت پر مسلط کرنے کی کاوش کی ہے، اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ انسانیت حقیقی روحانی واخلاقی قدروں سے دور ہوگئی ہے، وہ تیزی سے مادہ پرست ہوتی جارہی ہے۔

قساوت قلبی، سنگ دلی، خودغرضی، مفاد پرستی، اپنی ذات کی پرستش، انانیت، اور جنسی آوارگی جیسی بیماریوں نے انسانیت کا گھیراؤ کر لیا ہے۔

انسان، کائنات اور تخلیق کائنات کے مادی نوعیت کے عقیدے کے اثرات بد سے انسانیت بچ سکے،مشکل ہے، انسانیت کی قیادت وسیادت کا مادہ پرست مغرب کے ہاتھوں میں آجانا، انسانیت کے لئے سب سے بڑا المیہ ہے کہ اس کی وجہ سے انسانیت، سلیقہ انسانیت کے ہولناک بحران سے دوچار ہوگئی ہے۔

(۲) ہماری اجتماعی زندگی کی ایک بڑی کمزوری (جس نے ہمیں ٹوٹ پھوٹ اور انتشار سے دوچار کیا ہے) وہ یہ ہے کہ ہم میں قوت برداشت موجود نہیں رہی اور اختلاف رائے کو ہم ہرصورت میں دشمنی اور ایک دوسرے سے تعلقات کے خاتمہ کا ذریعہ قرار دیتے ہیں،ہماری یہ روش ایسی ہے، جو ہمیں ملی سطح پر اتحاد واتفاق اور وحدت کے رشتہ میں منسلک نہیں ہونے دیتی، حالت یہ ہے کہ ایک جماعت سے کئی جماعتیں وجود میں آتی ہیں، ایک ادارے سے کئی ادارے قائم ہوتے ہیں اور ان جماعتوں اور اداروں کا ہدف تعمیری کام کم، ایک دوسرے کی مخالفت زیادہ ہوتی ہے۔

باہم ایک دوسرے سے سلیقہ سے رہنے کی صلاحیت کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ ملی وحدت کا نظام بُری طرح متاثر ہے، ہماری حیثیت منتشر قوم کی سی ہوگئی ہے اور ایک دوسرے کی مخالفت، ضد، جھوٹی انا، دوسروں کی تحقیر اور انہیں برداشت نہ کرنے کی روش عام ہے،کوئی بھی منتشر قوم یا ملت قوموں کی سطح پر کامیابی وسرفرازی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔

اس اعتبار سے ترقی یافتہ قوموں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسری بہت ساری خرابیوں کے باوجود ان میں ایک دوسرے کے لئے برداشت کا مادہ موجود ہے، ان کے ہاں اختلاف رائے دشمنی شمار نہیں ہوتی، ان کے ادارے مستحکم ہیں، ان کی قومی زندگی میں نظم وضبط موجود ہے، ان کے یہاں جماعتوں اور اداروں میں ٹوٹ پھوٹ کا وہ عمل جو ہمارے یہاں ہے، وہ نہیں ہے، قومی معاملات میں ان کے یہاں اتحاد واتفاق کی فضا موجود ہے، اختلاف رائے ہوتا ہے تو اس کا اظہار سلیقہ سے ہوتا ہے۔

ترقی یافتہ قوموں کی یہی وہ صلاحیت ہے، جس کی وجہ سے وہ ہم جیسی قوموں پر غالب ہیں اور مادی اعتبار سے ترقی کی راہ پر گامزن ہیں، ان قوموں کے یہاں برداشت کا یہ مادہ مذہبی تعلیمات نہ ہونے کے باوجود محض عقلیت اور غوروفکر کی وجہ سے ہے، جب کہ ہمارے مذہب کی تعلیم میں اتحاد واتفاق اور وحدت کے رشتہ کو مستحکم کرنے پر زور ہے، اور ہماری پاکیزہ اخلاقی تعلیمات میں اس کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔

ہم اگر انتشار سے بچنا چاہتے ہیں اور قوموں کی سطح پر زندہ رہنا اور ترقی کرنا چاہتے

ہیں تو ہمیں اجتماعی زندگی میں برداشت کا مادہ پیدا کرنا ہوگا اور اختلاف رائے کے باوجود ایک دوسرے کے احترام کے سلیقہ کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

اہل مغرب نے قومی اخلاق کو نظام تعلیم کا حصہ بنا دیا ہے، وہاں خالی ذہن بچے کی ذہن کی فراہی پر سب سے پہلے قومی اخلاق کے نقوش کو ثبت کیا جاتا ہے، جب قومی اخلاق کے حوالے سے ذہن کی فراہی پر نقوش وخطوط مستحکم ہوجاتے ہیں تو اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے، اہل مغرب نے اپنی تہذیب کی بقا کے لئے قومی اخلاق کو زندگی اور موت کے مسئلہ کی حیثیت دی ہے کہ اصولوں کی پابندی، وعدہ وفائی، وقت کی پابندی، اپنی ذمہ داریوں کی صحیح طور پر ادائیگی، ملاوٹ سے حفاظت، کرپشن سے بچاؤ، قوم کی بھلائی کے کام، ظاہری صفائی کا اہتمام وغیرہ یہ ساری چیزیں ان کے قومی اخلاق کا حصہ ہیں، جو نظام تعلیم کے ذریعہ ہر فرد کے مزاج میں راسخ کی جاتی ہیں۔

جب کہ بدقسمتی سے ہمارا نظام تعلیم اپنی پاکیزہ تہذیب کی بنیادی اور اصولی تعلیمات اور تربیت کے خطوط ونقوش سے خالی ہے، جس کی وجہ سے افراد پر ملی مفاد کے مقابلہ میں ذاتی مفاد غالب آجاتا ہے اور افراد میں وہ ساری خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں، جس سے معاشرہ میں بددیانتی، رشوت، لوٹ مار، ملاوٹ، دولت کے حصول کے لئے ملت کے مفاد کی پامالی جیسی بُرائیاں شامل ہیں۔

تربیت کے نظام کو تعلیم کا حصہ بنائے بغیر ملت کی پاکیزہ بنیادوں پر تربیت کی ساری کوشش ناکامی سے دوچار ہوں گی، اس نکتہ کو صاحبان اقتدار اور نظام تعلیم کے ذمہ داریوں کو پوری شرح وبسط کے ساتھ سمجھنا ہوگا۔

ہماری اجتماعی زندگی کی دوسری بڑی کمزوری (جس نے ملت کو زبوں حالی سے دوچار کیا ہے) وہ قومی وملی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینے کی روش ہے، اس معاملہ میں ہمارے مؤثر طبقات اس حد تک آگے نکل گئے ہیں کہ وہ قومی خزانے کی لوٹ مار، بدعنوانی، رشوت اور ٹیکس چوری کے ذریعہ قوم وملت کو آخری حد تک پامال، مفلس اور ذلیل کرنے کی روش پر گامزن ہیں، حالت یہ ہے کہ جس کا جہاں بس چلتا ہے، وہاں وہ بدعنوانی کے ذریعہ ارب پتی بننا چاہتا ہے، اور بن چکا ہے، اس طرح قوم اربہا ڈالر قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے اور قوموں کی سطح پر ہماری حیثیت بھکاری قوم کی سی بن چکی ہے، یہ نتیجہ ہے اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینے کا، بلکہ ذاتی مفاد کے جذبات سے بے قابو ہوکر اجتماعی مفاد کو پامال کرنے کا۔

جب تک ہم ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر قربان کرنے کے سلیقہ سے بہرہ ور نہ ہوں گے، ہماری حالت زار میں کوئی تبدیلی برپا نہیں ہوسکتی۔

ہمیں یہ نکتہ سمجھنا ہوگا کہ قومی اور اجتماعی مفاد سے ہی ہماری بہتری اور سلامتی وابستہ ہے، قوم کی یہ زبوں حالی اور پستی ہماری اپنی اور ہمارے نسلوں کے زوال اور غلامی کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

(۳) جب معاشرہ دنیا داری کی راہ پر گامزن ہوتا ہے تو افراد سے سلیقہ انسانیت رخصت ہوجاتی ہے اور سماجی ومعاشرتی تقریبات میں جھوٹی انا، نمائش اور جھوٹی شان کے مظاہرے کی کوشش ہوتی ہے اور اسے باعث عزت وفخر سمجھا جاتا ہے، مثلاً شادی کی تقریبات ہی کو لیجئے، شادی کی تقریبات میں پہلے بڑی سطح کے دولتمندوں اور افسروں کی طرف سے پانی کی طرح پیسہ بہا جاتا تھا اور حیا وشرم سے عاری موسیقی کی دھنوں سے تقریب کو سجایا جاتا تھا، اب جھوٹی نمائش کی یہ روش کلرک اور پرائمری سطح کے اساتذہ تک میں عام ہوگئی ہے اور چند گھنٹوں تک شادی ہال میں موسیقی کی دھنوں کا وہ اودھم مچ جاتا ہے کہ الامان والحفیظ۔

اس طرح کی تقریبات میں عام طور پر پردہ کا اہتمام بھی کم ہی ہوتا ہے، عورتیں سج دھج کر شادی ہال میں آتی ہیں، یہ ساری چیزیں غیر اسلامی تہذیب ہی کا حصہ ہیں، دکھ کی بات یہ ہے کہ دیندار افراد کی معاشرتی نوعیت کی تقریبات میں بھی اس طرح کی خرافات اور غیروں کی تہذیب کے مظاہرے ہوتے ہیں اور انہیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ شریعت مطہرہ کے منافی چیزیں ہیں اور اللہ کے عتاب اور اس کی ناراضگی کا موجب بھی۔

معاشرے میں نکو بننے سے بچنے کے لئے یہ سب جھوٹی شان ومان کی ادائیں ہیں، جو کمزوریٔ ایمان کا نتیجہ ہے۔

چونکہ یہ چیزیں معاشرے میں عزت اور بڑے بننے کی علامتیں بن گئی ہیں، اس لئے مصنوعی طور پر بڑا بننے اور بڑے پن کے مظاہرے کے لئے اپنی اولاد کی شان ومان سے

شادی کرنے اور شرم وحیا سے عاری موسیقی کی دھنوں کے جلو میں یہ سارا اہتمام کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے، اس معاملہ میں دیندار لوگوں کی دینداری بھی رخصت ہوجاتی ہے، دل کو مطمئن کرنے کے لئے وہ آخر میں مولوی صاحب سے شادی کی کامیابی کے لئے دعائے خیر کرالیتے ہیں، یاد رکھنا چاہئے کہ سماجی ومعاشرتی تقریبات میں ہونے والی غیر شرعی حرکتیں اور لاکھوں روپے کا خرچہ یہ روش اسلام اور اسلامی روایات کے بالکل منافی ہے اور غیروں سے مشابہت اختیار کرنی ہے، حدیث شریف ہے کہ جو جس کی مشابہت اختیار کرتا ہے، وہ آخرت میں انہی کے ساتھ اٹھے گا۔

نماز، عبادت اور ذکر وفکر اگر ہمیں اس طرح کے معاملات میں غیروں کی مشابہت اختیار کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے تو اس طرح کی عبادت بے روح وبے جان ہے، وہ اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ فرد تیار کرنے میں ناکام ہے، اگر ہم انفرادی واجتماعی زندگی میں دنیاداری اور مادیت کے سیلاب میں تنکوں کی طرح بہتے چلے جارہے ہوں تو پھر ہمارا اسلام کہاں رہا، ایسا اسلام جو مسجد تک محدود رہے، وہ تو پوجا پاٹ تک محدود ہوگیا، وہ تو کامل دین نہ رہا جس کا ہم سے مطالبہ ہے **"ان الدین عند اللہ الاسلام"**.

(۴) عیب جوئی اور عیب گوئی ایسی بیماری ہے، جس سے جوڑ پیدا ہونے کی بجائے توڑ پیدا ہوتا ہے اور نفس کی اصلاح کا عمل بھی بُری طرح متاثر ہوتا ہے، یہ بیماری دراصل اپنے عیبوں سے صرف نظری اور دوسروں کے عیبوں پر عقابی نظر کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، دوسرے الفاظ میں یہ بیماری اپنی شخصیت کی فضیلت اور دوسروں کی تحقیر کی نفسیات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اس موضوع پر حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے نہایت قیمتی علمی گفتگو فرمائی ہے، جو ذیل میں دی جارہی ہے۔

"عیب گوئی وعیب جوئی ایک ایسا شعبہ ہے، جس میں بہت سے پڑھے لکھے آدمی بھی پڑے ہوئے ہیں اور اس کی خرابیوں پر تو نظر کیسی، اس کو اچھا کام سمجھے ہوئے ہیں، وہ یہ ہے کہ اپنی فکر چھوڑ کر دوسروں کی اصلاح کے درپے ہوتے ہیں، یہ بظاہر ایک عمل صالح معلوم ہوتا ہے، لیکن اس میں ایک شیطانی دھوکہ ہے، برائی ہے اور برائی بھی بہت خفی ہے جس پر بہت گہری نظر والا اطلاع پاسکتا ہے، وہ خفی برائی یہ ہے کہ یہ درحقیقت اصلاح نہیں، عیب جوئی ہے۔

بیان اس کا یہ ہے کہ بعض لوگ غیبت اور عیب جوئی وغیرہ سے احتراز کرنا چاہتے ہیں اور شیطان ان کو بہت سی ترکیبوں سے اس میں مبتلا کرنا چاہتا ہے، جب کوئی داؤ نہیں چلتا تو یہ سمجھاتا ہے کہ دوسرے کی اصلاح کر وبنظر عیب جوئی نہ سہی بنظر اصلاح، اس کے حالات میں غور کرو، یہ ایسا دھوکہ ہے کہ اس سے بچنا بہت ہی مشکل ہے، اس دام میں آکر دوسروں کے عیوب پر نظر ڈالنے کی عادت ہوجاتی ہے اور دل میں یہ اطمینان ہوتا ہے کہ ہم عیب جوئی تھوڑا ہی کرتے ہیں، بلکہ اس کی اصلاح کے درپے ہیں، جہاں کہیں بیٹھے ہیں، ان عیبوں کا ذکر کرتے ہیں اور اچھی طرح غیبت کر لیتے ہیں، آخر میں دل کو تسلی دینے کے لیے اور اپنی برأت قائم رکھنے کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ بھائی، خدا اس کے حال پر رحم کرے، یہ عیوب اس میں ہیں، ان کو دیکھ کر بڑا دل دکھتا ہے، ہم بطور غیبت کے نہیں کہتے، بلکہ ہم کو ان سے تعلق ہے، یہ برائیاں دیکھ کر ہم کو رحم آتا ہے، خدا کرے یہ برائیاں کسی طرح چھوٹ جائیں۔

سبحان اللہ! بڑے خیر خواہ ہیں، سر سے پیر تک تو اس کا گوشت کھالیا، مجمعوں میں اس کو ذلیل کرلیا اور ایک کلمہ سے بری ہوگئے، یہ نفس کی چالیں ہیں، اس سے آپ کو دونقصان پہنچتے ہیں، ایک اپنی اصلاح سے رہ جانا، دوسرے غیبت وغیرہ گناہ میں پڑنا اور چونکہ اس کی برائی بھی نظر میں نہیں ہے، اس واسطے اس بلا سے نکلنا بھی بڑا مشکل ہے، میں آپ کو ایک پہچان بتلائے دیتا ہوں، جس سے اگر آپ کام لیں گے تو انشاء اللہ ان دھوکوں میں نہ پڑیں گے، وہ یہ ہے کہ یاد کر لیجیے کہ اطاعت میں لذت نفس نہیں ہوتی اور جس کام میں لذت نفس ہو، وہ اطاعت نہیں ہوتا، اگر آپ کو یہ معلوم کرنا ہے کہ ہمارا یہ فعل غیبت اور طعن ہوا یا نہیں تو انصاف کے ساتھ حالت نفس کو تلاش کیجیے کہ ان بیانات کے وقت آپ کو لذت حاصل ہوتی ہے تو کھٹک جایئے کہ اس میں نفس کی چال پوشیدہ ہے اور یہ عمل شیطانی ہے، اطاعت نہیں ہے، اس کی ایک بہت موٹی پہچان یہ ہے کہ بار بار ان عیوب کو کہنے کو جی چاہتا ہے، اگر وہ گناہ نہ ہوتا تو وہ آپ کی زبان پر ایسے آتا کہ جیسے آپ کا کوئی بیٹا نالائق ہو اور برے افعال میں مبتلا ہو اور آپ کو تنگ کرتا ہو، اس کے عیب آپ کی زبان پر ہر جگہ نہ آئیں گے، بلکہ اس کے زبان پر آنے سے آپ کا دل دکھے گا اور خفت بھی ہوگی اور حتی الامکان یہ چاہیں

گے کہ یہ عیب کسی پر ظاہر نہ ہوں۔''

(۵) ایک فاضل شخصیت نے دینی حلقوں کو دو امور کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس دور کی اہم ضرورت ہیں۔ لکھتے ہیں:

مغرب کی لائی ہوئی جمہوریت اور اس کا سیکولرزم، ان دونوں کا سانچہ مغربی ہے، اسلام پسند لوگ بھی اسی سانچہ میں اسلامی طریقۂ کار کو سمونے کی تدبیر پر اکتفا کرتے ہیں، جو ناکام ہوجاتی ہے، صحیح الفکر افراد کی تعداد غیر صحیح الفکر افراد کی تعداد سے زیادہ کرنی ہوگی، اس کے لئے تربیتی ودعوتی نظام کو پوری تندہی چلانا ہوگا اور صبر اور برداشت کے ساتھ امت کی اکثریت کو اس میں ڈھالنا ہوگا، پھر وہ طاقت حاصل ہوگی، جس کو دشمن شکست نہ دے سکے گا۔

اس اہم پہلو کے ساتھ دوسرا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں طریقہ کار کے لحاظ سے جو فرقہ بندی اور اختلافی صورت کردی گئی ہے، وہ دور کی جائے اور اتحاد پیدا ہو، اس کے لئے اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے دوسرے کی رائے کا احترام کرنا ہوگا اور جوش میں آکر ہوش کی باتوں کو نظر انداز کرنے سے بچنا ہوگا، جس کی اس وقت امت مسلمہ میں بہت کمی ہے کہ ایک ہی مقصد کے لئے کئی کئی گروہوں میں بٹ کر اپنی متحدہ طاقت کو مسلمان برباد کر رہے ہیں، اور دوسرے کے کام اور مقام کو ٹھکرا کر، اپنی متفقہ حیثیت کو سخت نقصان پہونچا رہے ہیں، ہر ایک اپنی رائے کو قرآن وحدیث کی بات کی طرح اعلیٰ سمجھتا ہے اور دوسرے کو غلط کار اور ناقابل اعتبار سمجھتا ہے، اس مرض کو دور کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔''

(۶) اس دور میں تصوف نے جو عمومی صورت اختیار کی ہے، وہ ایسی ہے جس کی بنا پر تصوف کی حمایت ووکالت کرنا دشوار ہے۔

ایک تو تصوف کے نام پر بڑی بڑی درگاہیں ہیں، جو خاندانی میراث کا حصہ ہیں، دوم یہ کہ بزرگی کے نام پر سرمایہ داری اور مالداری کا مظاہرہ ہے اور شان ومان کا انداز غالب ہے، سوم یہ کہ تصوف سے علم رخصت ہوگیا ہے، تقلید محض عام ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے بہتر علمی مزاج کے حامل افراد کے لئے نہ صرف یہ کہ تصوف سے طبعی مناسبت پیدا نہیں ہورہی ہے، بلکہ تصوف واہل تصوف سے دوری کی فضا غالب ہے۔

چہارم یہ کہ بعض اہل تصوف نے ذہنی مشقوں اور تسخیری وظائف کی بنا پر مقبولیت حاصل کرکے لوگوں کی کافی تعداد کو ہپناٹایز کردیا ہے، جو سخت معیوب بات ہے، ان ساری چیزوں نے مل ملا کر تصوف کو معاشرے میں سخت متنازعہ بنا دیا ہے۔

اس طرح کے حالات میں فقیر منش اور درویش صفت اہل تصوف نے نام ونمود اور دولت سے بے نیاز ہوکر کنارہ کشی اختیار کرلی ہے، یہی وہ درویش صفت اہل تصوف ہیں، جن کی صحبت سے افراد کو پاکیزہ سیرت وکردار کے حوالے سے ایک نئی زندگی حاصل ہوتی ہے، ہمارا زور اسی طرح کے اہل اللہ کی صحبت پر ہے۔

(۷) اخلاص کے ساتھ ہونے والی علمی تنقید معاشرے کے لئے خیر کا باعث ہوتی ہے، جب کہ نفسی آمیزش کے ساتھ ہونے والی تنقید نقصاندہ ہے، اس طرح کی تنقید درج ذیل نقصانات کا موجب بنتی ہے۔

(۱) تنقید میں شخصیت کی تحقیر کی آمیزش شامل ہوتی ہے۔

(۲) اپنی علمی برتری اور شیخی کا اظہار ہوتا ہے۔

(۳) تنقید میں غیرضروری مباحث شامل ہوتے ہیں۔

(۴) جزوی نوعیت کی چیزوں کو فیصلہ کن اہمیت دے کر ان پر تنقید ہوتی ہے۔

(۵) تنقید سے متعلقہ شخصیت سے وابستہ افراد کی سخت دل آزاری ہوتی ہے۔

(۶) تنقید (اگر مشہور علمی شخصیت پر ہو) تو اس سے امت میں خلفشار پیدا ہوتا ہے اور گروہ بندی کی صورت پیدا ہونے لگتی ہے۔

(۷) تنقید سے جواب در جواب کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

(۸) صاحب تنقید شخصیت کے گرد ایک گروہ جمع ہونے لگتا ہے، جو امت سے کٹ کر اس سے وابستہ ہوتا ہے اور اس کی فکر کو پھیلانے میں مصروف ہوتا ہے۔

(۸) سلیقہ انسانیت سے آراستگی کے سلسلہ میں پاکیزہ کردار کی حامل شخصیت کی صحبت کو بنیادی عمل دخل حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ نفس اور معاشرے کے اثرات سے بچنے کے لئے صالح انسانوں کی صحبت کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔

صالح صحبت سے پاکیزہ کیفیتوں کی منتقلی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جس سے نفسی قوتوں

کی ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری رہتا ہے، جس طرح ذکر کا کوئی بدل نہیں، اسی طرح صحبت کا بھی کوئی بدل نہیں، تصوف میں کسی سالک کی روحانی ارتقا اور اصلاح نفس میں ترقی کا جو پیمانہ رہا ہے، وہ یہ ہے کہ سالک کا صحبت کا دورانیہ کیا ہے، صحبت سے سالک میں مثبت شعاؤں کی عکس ریزی کا عمل جاری رہتا ہے، صحبت سے صحبت اور ذکر کے انوار دونوں مل کر طالب کی سیرت وکردار کو پاکیزہ بناتے ہیں۔

جب ان میں سے ایک چیز کی بھی کمی واقع ہوتی ہے تو سالک کی اصلاح بُری طرح متاثر ہوتی ہے، اور وہ نفس کے زیر اثر دوسروں کی تحقیر کرنے لگتا ہے، اہل اللہ کی صحبت ایسی چیز ہے، جس کے بغیر فرد کی سیرت کی تعمیر اور پاکیزگی نہیں ہوسکتی، صحبت سے محروم فرد کے لئے نفس کی خوفناک اور حیرت انگیز قوتوں کو سمجھنا اور پھر ان سے بچنا محال تر ہوتا ہے۔

منتہی صوفی جو نفس کی ان ساری واردات سے گزر چکا ہوتا ہے، وہی نفس کی مکر وفریب کی واردات کو سمجھتا ہے، جو طالب خودسپردگی کے ذریعہ اپنے آپ کو مکمل طور پر ان کے حوالے کرتا ہے تو ایسے طالبوں پر ہی نفس کی عیاریاں منکشف ہونے لگتی ہیں۔

دوسری صورت میں باصلاحیت فرد معاشرے میں جتنا بھی فساد برپا کرے کم ہے، موجودہ دور میں ہماری قومی وملی زندگی میں برپا ہونے والا سارا فساد نفسی قوتوں ہی کا نتیجہ ہے کہ افراد، اصلاح کے لئے اپنے آپ کو کسی اہل اللہ کے سامنے پامال کرنے کے لئے تیار نہیں۔

نفس نہ تواں الاظل پیر
پیش مرد کامل پامال شو

(۹) معاشرے کی اسلام سے ہم آہنگ سلیقۂ انسانیت کی بنیاد پر تربیت کے لئے سیاسی نظام، ریاستی نظام، انتظامی ڈھانچہ، تعلیمی نظام اور میڈیا کے نظام کی صحیح خطوط پر تشکیل کا کام ضروری ہے، اس کے بغیر معاشرہ ہمہ جہتی وہمہ گیر فساد ہی سے دوچار ہوگا اور مادیت اور نفسانیت کا دور دورہ ہوگا، اور اخلاقی وروحانی اصلاح کا عمل بُری طرح متاثر ہوگا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہمارے معاشرے میں کوئی طاقتور جماعت ایسی نظر نہیں آتی، جو ریاست کے اجتماعی نظام کی صحیح خطوط پر تبدیلی کا مؤثر طور پر کام کر سکے۔

ہمارے مذہبی طبقات کا دائرہ کار مساجد ومدارس کو سنبھالنے تک محدود ہے۔ دینی وسیاسی جماعتوں کی سرگرمیاں ہنگامی سیاست تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، جدید تعلیمی ادارے جو سرکاری ہوں یا پرائیویٹ، وہ روایتی اور کاروباری صورت اختیار کر چکے ہیں، بلکہ وہ عام طور پر مادی فکر کو فروغ دینے کا موجب ہیں۔

ان حالات میں ضروری ہے کہ ایسے دیندار افراد سامنے آئیں، جو مذکورہ شعبوں میں اسلامی فکر اور اسلامی تربیت سے ہم آہنگ فکر کے فروغ کے لئے منصوبہ بندی سے کام شروع کریں، کم از کم جدید نوعیت کے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے ذریعہ ایسے افراد تیار ہو سکتے ہیں، جو مادی ونفسی جذبات کی بجائے اللہ سے والہانہ محبت کے جذبات سے سرشار ہوں اور جن کی زندگی کا ہدف معاشرے اور ریاست کی صحیح اسلامی خطوط پر تشکیل کا کام ہو اور جو اخلاقی وروحانی طور پر خود بھی مستحکم ہوں تو افراد معاشرہ کی اس سمت میں تربیت کے لئے بھی کوشاں ہوں۔

(۱۰) اس وقت عالمگیریت نے قوموں اور معاشروں کو مادیت میں اس طرح جکڑ لیا ہے کہ اس سے بلند ہو کر اعلیٰ اور پاکیزہ مقاصد کے لئے سوچ اور اس کے لئے فکرمندی کا کام بُری طرح متاثر ہوا ہے۔

میڈیا کی قوت عالمگیریت کے پاس ہے، دنیا کی معیشت پر ان کا قبضہ ہے، دنیا کا بیشتر سرمایہ پانچ سوملٹی نیشنلز کے پاس ہے، دنیا کے بیشتر ممالک نے اپنی آزادی کو قرضوں کی وجہ سے عالمی سرمایہ دار کے پاس گروی رکھ دیا ہے، آزادی اور حریت کے نام پر افکار نے مسلمانوں کے سارے مراعات یافتہ طبقات کو مادیت پرستی کی عالمی قوتوں کا فکری غلام بنالیا ہے، عالمگیریت کی یہ جکڑ بندی ایسی ہے، جس سے نکلنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

مسلمان ممالک کے حکمران طبقات ذہنی طور پر مغربی فکر سے آزاد ہوں اور اپنے پاکیزہ نظریے کے حامل ہوں تو اس کے بعد ہی ریاستی نظام میں تبدیلی کی صورت پیدا ہوسکتی ہے، غلامانہ ذہنیت اور مادی طور پر خوشحال سے خوشحال تر بننے اور زیادہ سے زیادہ دولتمند بننے کے جنون اور نفس پرستی کے قوتوں کے غلبہ کی صورت میں تو ریاستی نظام میں پاکیزہ بنیادوں پر تبدیلی کا ہونا امر محال ہی ہے۔

(۱۱) مسلم امت کے مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی شامل ہے کہ وہ اپنے پاکیزہ کردار اور دعوت کے ذریعہ دوسری قوموں تک اسلام کا پیغام پہنچائیں، تاکہ انسانیت آخرت میں نجات کے ساتھ ساتھ معرفت رب کی وجہ سے سلیقہ انسانیت سے بہرہ ور ہو،لیکن اس مقصد کی تکمیل تو دور کی بات ہے، امت کے سارے مؤثر طبقات مادہ پرست قوموں کی طرف سے پیش کردہ مادیت پر مشتمل فکر کی دلدل میں پھنس گئے ہیں، امت کا تعلیمی نظام انہی سے ماخوذ ہے، میڈیا انہی کی تقلید کی دعوت دے رہا ہے، حکومت کی بیشتر پالیسیاں یا تو انہی کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں یا ان کے فکری خطوط پر مشتمل ہوتی ہیں، یہ المناک صورتحال ہے جس سے ہم اس وقت دوچار ہیں۔

(۱۲) مغربی تہذیب کے علمبرداروں نے سیکولرزم کے نام پر جو نئے بت تراشے ہیں، جن کی پوجا میں وہ مصروف ہیں، جو ان کے مقصود ومعبود ہیں، وہ ایک نومسلم اسکالر کی نظر میں درج ذیل ہیں، یہ نومسلم اسکالر علامہ اسد ہیں، جنہوں نے آج سے ستر سال پہلے مغرب کے ان نئے معبودوں کی بہتر اور مؤثر طور پر نشاندہی کی تھی، لکھتے ہیں:

''سیکولر مذہب کے ''معبد'' بلند وبالا بنک، دیو قامت فیکٹریاں، ہائیڈوالیکٹرکس، رقص گاہیں اور سینما ہالز ہیں، جب کہ ان کے پروہت (مذہبی پیشوا) بنکار، صنعت کار، فلمی ستارے، مشہور کھلاڑی اور انجنیئرز ہیں۔''

(۱۳) اللہ کی ذات پر یقین، آزمائش پر صبر، حمیت دین، داعیانہ کردار اور فقر یہ ایسی صفات ہیں، جو بندہ مومن کی امتیازی شان ہیں اور یہی صفات، سلیقہ انسانیت کا جوہر ہیں، عہد جدید کے مادیت کے طوفان کے رخ کو موڑنے کے سلسلہ میں انہی صفات کے حامل داعی ہی اہم کردار ادا کرسکتے ہیں، جس معاشرے کو اس طرح کے داعی حاصل ہوجائیں، وہ معاشرہ سب سے زیادہ خوش نصیب معاشرہ شمار ہوگا۔

(۱۴) معاشرے میں دعوتی کام کے لئے داعیانہ کردار کی ضرورت ہے، مخلص داعی تنہا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ اللہ کی مدد شامل ہوتی ہے، **"کان حقا علینا نصر المومنین"** (مومنوں کی مدد کرنا ہم پر حق ہے)۔

داعی اگر مخلص ومتحرک ہو، اپنی ساری توانائیاں دعوت کے کام میں خرچ کررہا ہو، صاحب استقامت بھی ہو تو وہ اللہ کی مدد کا مستحق ہوتا ہے، اس کے ساتھ اللہ کی مدد کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدہ کے خلاف ہرگز نہیں کرتا۔

داعی کے ساتھ اللہ کی مدد کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ حالات اس کے حق میں اس طرح موافق بنتے جاتے ہیں کہ داعی بآسانی اپنی ضروریات پوری کرلیتا ہے دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں داعی کے بارے میں ایسے خیالات ڈال دیئے جاتے ہیں کہ وہ داعی کے کام آجاتے ہیں اور اس کے کام کو اپنا کام سمجھنے لگتے ہیں، داعی کے ساتھ نصرت کی تیسری صورت یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذہن کو ایسی تدابیر کی طرف لے جایا جاتا ہے، جس کے بعد مسائل کے حل ہونے کی صورت خود بخود پیدا ہوجاتی ہے۔

مستحکم ایمان کی برکت سے داعی کی ذہنی اور نفسیاتی صلاحیتوں کو اس طرح جلا بخشی جاتی ہے کہ کم صلاحیتوں کا داعی بہتر صلاحیتوں والے سے زیادہ کام کرلیتا ہے، مقابلہ کے وقت داعی کے دل کو مضبوط کردیا جاتا ہے اور دشمن کو مرعوب کرکے شکست کو آسان بنا دیتا ہے۔

داعی کا کام انہی حالات کے اندر ہی ہوتا ہے، جیسے دوسروں کے ہوتے ہیں، فرق یہ ہوتا ہے کہ داعی کے اخلاص، استقامت، درمندی، ایمانی جذبہ اور تحرک کی برکت سے حالات اس طرح سازگار ہونے لگتے ہیں کہ وہ کم تر وسائل سے زیادہ کام کرنے لگتا ہے اور معمولی سازوسامان کے باوجود وہ زیادہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

(۱۵) ایسے اسلامی مفکر جنہوں نے اسلام کو نظام حیات کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور غلبہ اسلام کی جدوجہد کے لئے شعور پیدا کیا ہے، وہ ایک اعتبار سے ملت کے لئے سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے کہ عہد جدید میں ایک تو دوسرے مذاہب ذاتی زندگی میں پوجا پاٹ تک محدود ہوگئے ہیں، دوسرے یہ کہ مادہ پرست عالمی قوتوں نے پوری انسانیت کو الحاد ودہریت، سیکولرزم اور مادیت کی راہ پر لگانے کے لئے کاوشیں تیز تر کردی ہیں اور ہر ریاست میں میڈیا کو خرید کر، انہوں نے اسے اس مقصد کے لئے استعمال کرنا شروع کیا ہے، دانشوروں اور صحافیوں کا ایک خاصا طبقہ ہے، جو عالمی سرمایہ دار کی پشت پناہی میں چاہتا ہے

کہ مسلم معاشرہ پوری طرح مادیت کی اس راہ پر گامزن ہو، جدید اسلامی مفکروں کا اس محاذ پر ہونے والا کام قابل قدر ہے کہ انہوں نے افراد کی ایک ٹیم پیدا کی ہے، جو صحافت، میڈیا اور تعلیم کے محاذ پر ان کا مقابلہ کررہی ہے اور جدیدیت سے متاثر افراد کو اسلامی فکر سے قریب کرنے کے لئے کوشاں ہے۔

وہ مذہبی حلقے جو جدید دور کے چیلنج کی ہمہ گیر نوعیت کو نہیں سمجھتے، وہ جدید مفکروں کے اس کام کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

(۱۶) زیادہ علمی وذہنی صلاحیتوں اور سیاسی، معاشی ومعاشرتی اعتبار سے مستحکم افراد میں عام طور پر اپنی برتری کا احساس پیدا ہوجاتا ہے، جو ان کے لئے حق وحقیقت کے فہم کے راستے میں حائل ہوجاتا ہے۔

اسی طرح فنائیت کے مراحل طے ہونے سے پہلے کشف بھی عام طور پر دعویٰ کا موجب بن جاتا ہے، معاشرے میں پیدا ہونے والی خرابیوں میں احساس برتری اور دعویٰ کو بنیادی عمل دخل حاصل ہے، اس کی وجہ سے فردوافراد سے حدود اور آپے میں رہنے اور سلیقۂ انسانیت کی استعداد سلب ہوجاتی ہے اور حق وحقیقت کی راہ میں نازک قسم کے حجابات پیدا ہوجاتے ہیں۔

اس کا علاج یہی ہے کہ مذکورہ صلاحیتوں کے حامل افراد کسی صاحب دل شخصیت کو اپنے سے افضل سمجھکر، اس کی رائے کو مقدم سمجھیں اور اس کے سامنے خود سپردگی اختیار کریں، اس سے انشاء اللہ احساس برتری اور دعویٰ کی نفسیات سے دستبرداری کی صورت پیدا ہوگی۔

(۱۷) جب تک نفس کا دیو قابو میں نہیں آتا، تب تک مزاج میں ٹھہراؤ، اعتدال، پاکیزہ احساسات اور سلیقۂ انسانیت حاصل نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ اس صورت میں نفس کی دنیا میں تہلکہ برپا رہتا ہے، جس سے بد اطواری، بدخلقی اور اعمال بدنمودار ہوتے ہیں، اس لئے زندگی کے کاموں کی ترجیحات میں نفس کو قابو کرنے اور اسے مہذب بنانے کے کام کو اولیت حاصل ہونی چاہئے، دوسری صورت میں فرد، زندگی بھرنفس کے دیو کے زیر اثر دوسروں کی اذیت رسانی اور ناپاکیزہ احساسات کا شکار رہے گا اور اور اپنی پیدائش کے اصلی مقصد یعنی عبدیت سے محروم رہے گا۔

(۱۸) اصلاح نفس کے مراحل سے گزرے بغیر فرد پر نفس کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی، اس صورت میں فرد، نفس پرستی کی وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے، کبھی ریا وشہرت کے جذبات سے مغلوب ہوتا ہے تو کبھی حسد وجلن کے جذبات سے، غرض کہ نفسی جذبات کی ایک وسیع دنیا ہوتی ہے، جس میں فرد مبتلا ہوتا ہے جو اس کے سکون کو برباد کردیتی ہے اور اس کی اصل شخصیت یعنی روح کو مجروح کردیتی ہے، نفسی دنیا سے آشنائی اور نفسی قوتوں پر فتحیابی کے بغیر فرد دائرہ انسانیت اور سلیقہ انسانیت سے دور ہوجاتا ہے، اور روح کی طمانیت کے لئے مادی نوعیت کے سہاروں سے کام لینے لگتا ہے، ظاہر ہے یہ مادی سہارے روح کی تسکین میں ناکام رہتے ہیں۔

(۱۹) علوم وفنون سے خودشناسی اور اللہ شناسی (یعنی عقیدہ توحید) کو نکالنے کے بعد انسان کے حیوانی وجود کی نشوونما کی صورت تو بہتر طور پر ہوجاتی ہے، لیکن اقبال کی زبان میں انسان کی خودی کی موت واقع ہوجاتی ہے، خودی کے بغیر انسانی وجود اس دنیا میں بھی شدید اذیت اور صدمات سے دوچار ہوتی ہے تو موت کے بعد بھی اسے بے پناہ صدمات سے دوچار ہونا پڑے گا۔

مسلم امت جو دوسری قوموں کے لئے اتمام حجت کی حیثیت رکھتی ہے، اگر اس کے علوم وفنوں سے خودشناسی اور اللہ شناسی کو نکال کر، مادہ پرست قوموں کے تصور تعلیم کو شامل کیا جائے تو یہ دراصل قومی خودکشی کے مترادف ہے، اس سے دنیا اور مادیت کو مقصود بنانے والے حیوان صفت افراد ہی پیدا ہو سکتے ہیں، جن سے ملی نقطہ نگاہ سے خیر کی کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی۔

(۲۰) اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث مبارک ہمارے لئے سرمایہ حیات کی حیثیت رکھتی ہیں، ہم اگر دل کی گہرائیوں سے ان کو پڑھیں اور سنیں تو ہماری زندگیوں میں حقیقی تبدیلی پیدا ہوسکتی ہے۔

اس سلسلہ میں یہاں ایک حدیث مبارکہ پیش کی جاتی ہے، جو جامع حدیث ہے۔

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں رسول اقدس ﷺ کی سواری پر آپ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، آپ نے فرمایا، بیٹے، میں تمہیں کچھ باتیں سکھاتا ہوں، جن سے

اللہ تمہیں نفع پہنچائے گا۔

(۱) اللہ کی طرف متوجہ رہا کرو تو وہ تمہاری طرف متوجہ رہے گا۔

(۲) اللہ کا دھیان جمایا کرو تو تم اللہ کو اپنے سامنے موجود پاؤ گے۔

(۳) جب کچھ مانگنا ہو تو اللہ سے مانگا کرو اور مدد چاہئے تو اسی سے مانگو۔

(۴) خوب جان لو کہ سارے انسان مل کر بھی اگر تمہیں کچھ فائدہ پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے، مگر وہی فائدہ، جو اللہ نے تمہاری تقدیر میں لکھ رکھا ہے۔

(۵) اگر سارے انسان مل کر تمہیں نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے، مگر وہی جو اللہ نے تمہاری تقدیر میں لکھ رکھا ہے۔

(۶) جان لو کہ ناپسندیدہ باتوں پر صبر کرنے میں اللہ نے بہت بھلائی رکھی ہے، اللہ کی مدد صبر کرنے پر ہی ملتی ہے۔

(۷) تکلیف کے ساتھ اللہ نے نجات بھی رکھی ہے اور تنگی کے ساتھ آسانی۔
(ترمذی شریف)

(۲۱) ہماری انفرادی واجتماعی زندگی کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ ہم داخلی اور باطنی بیماریوں میں مبتلا ہونے کے باوجود نہ صرف یہ کہ ان بیماریوں کے علاج کی فکرمندی سے خالی ہیں، بلکہ ان بیماریوں کے ادراک وشعور ہی سے قاصر ہیں، یہ داخلی وخارجی بیماریاں حب جاہ، حب مال، انانیت، حرص ہوس، اور مادی حسن پر فدائیت وغیرہ کی بیماریاں ہیں، ان میں سے ہر بیماری ایسی ہے، جو قوم وملت کی تباہی کے لئے کافی ہے، مثلا حب مال ہی کی بیماری کو لیجئے، حب مال، فردوافراد کو زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کے جنوں میں مبتلا کردیتا ہے، یہ ایسا نشہ ہے جو فردوافراد کو مدہوش کردیتا ہے اور سارے رشتوں کو پامال کردیتا ہے، حب مال کی خاصیت یہ ہے کہ فرد کو صرف اور صرف دولت چاہئے، وہ چاہے کسی بھی طریقہ سے آئے، لوٹ مار سے آئے، عزیز واقارب کا مال غصب کرنے سے آئے، خاندانی رشتوں کو پامال کرنے سے آئے، کہیں سے بھی آئے، اسے ہر صورت میں دولت چاہئے، اسی طرح تکبر کی بیماری ہے، اس بیماری کے مریض کو یہ خبط لاحق ہوتا ہے کہ وہ عقل کل ہے، باقی سب کو اس کی رائے اور اس کی فکر کے تابع ہونا چاہئے، اس بیماری کا مریض دوسروں کی تحقیر سے لذت حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، اگر ایسا فرد دانشور واہل قلم ہے تو اس کی دانش وتحریر سے کسی کی عزت وسلامتی محفوظ نہیں، اگر ایسا فرد دینی ومذہبی علم کا حامل ہے تو وہ سلف وخلف اور علمائے ربانیین کی دانش کی نفی کرکے، ان سب پر اپنی دانش کو فائق کرنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، اسے یہ خبط لاحق ہوتا ہے کہ اس کی علمی تحقیق ہی حرف آخر ہے، دوسروں کو اس کی دانش کے تابع ہونا چاہئے، ورنہ وہ زندگی بھر اپنی نئی علمی تحقیق کی برتری اور سلف وخلف کی تغلیط میں توانائیاں خرچ کرے گا۔

داخلی اور باطنی اصلاح سے محرومی کی وجہ سے سب سے بڑی سزا جو فرد وافراد کو ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ فرد وافراد قساوت قلبی اور سنگ دلی کا شکار ہوجاتے ہیں اور پاکیزہ احساسات اور پاکیزہ اخلاقیات سے محرومی رہتی ہے، یہ اتنی بڑی سزا ہے، جو ساری سزاؤں پر بھاری ہے، ایسے افراد کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ ان پر وعظ ونصیحت اور قرآن وسنت کی باتیں اثر انداز نہیں ہوتی، اگرچہ ظاہری طور پر کچھ نہ کچھ اصلاح ہوتی ہے، لیکن حب جاہ، حب مال، ضد، کدورت، نفرت اور مزاج کی سختی جیسی بیماریوں کی اصلاح نہیں ہوپاتی۔

یہ سب نتیجہ ہوتا ہے باطنی بیماریوں کو اہمیت نہ دینے کا، ایک فرد سرطان کا مریض ہو، لیکن اگر وہ اپنے مرض کی ہولناکی کو کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہ ہو اور اس کے علاج کی فکرمندی سے محروم ہو تو ظاہر ہے اس کی موت یقینی ہے۔

باطنی بیماریوں کا حال بھی یہی ہے کہ انہیں بیماریاں نہ سمجھنے کی وجہ سے دل اور روح کی مردگی واقع ہوجاتی ہے، جب دل وروح مردہ ہوجائیں تو کوئی دوا کارگر ثابت نہیں ہوتی۔

(۲۲) یہ اہم نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ جب تک باطن میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو کر، باطن کی صحیح اور پاکیزہ خطوط پر تعمیر نہیں ہوتی، تب تک کام نہیں بنتا اور فردوافراد کی تہذیب کا عمل مکمل نہیں ہوتا، باطن کی تعمیر کا کام صبر آزما جدوجہد کا متقاضی ہے، جس طرح آم کا درخت آم کی گھٹلی بونے اور اس کی نشوونما کے کئی مراحل سے گزرنے کے بعد ہی آم دینے کے قابل بنتا ہے، اسی طرح باطن کی پاکیزہ بنیادوں پر تربیت کا عمل بھی صبر آزما اور دیرپا عمل ہوتا ہے، لیکن جب یہ ہوتا ہے تو اس کے نتیجہ کے طور پر فرد زندگی بھر اس کے

پاکیزہ ثمرات سکون قلبی اور اعمال صالحہ کی صورت میں حاصل کرتا ہے اور ان نعمتوں میں ترقی پر ترقی حاصل کرنے لگتا ہے۔

لیکن اگر فرد باطن کی تعمیر کے لئے ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزرنے کے لئے تیار ہی نہ ہو، یا تیار تو ہو، لیکن جلد بازی سے اس عمل سے فارغ ہونا چاہتا ہو، اس کے لئے صبر اور حوصلہ کے مظاہرے کے لئے آمادہ نہ ہو تو ایسا فرد سیرت کی پاکیزہ بنیادوں پر تعمیر کے عمل سے محروم رہتا ہے اور وہ حالات اور زمانہ کی تھپڑوں کا شکار ہوکر پتوں کی طرح زیر وزبر ہوتا رہتا ہے۔

سیرت سازی اور کردار سازی کے لئے باطن کی تعمیر ناگزیر ہے، اس کے بغیر چارہ کار ہی نہیں ہے، باطن کی اصلاح باطن کی وسیع دنیا کی ٹوٹ پھوٹ اور اس کے ازسرنو تعمیر کے بغیر نہیں ہوسکتی۔

(۲۳) خود پسندی (جسے خود نمائی اور خود ثنائی بھی کہہ سکتے ہیں) یہ ایسی بیماری ہے، جس میں ہم میں سے لگ بھگ ہر فرد کسی نہ کسی حد تک مبتلا ہے، اس بیماری کی خصوصیت یہ ہے کہ فرد اپنی معاصر شخصیتوں کی تحقیر میں لذت محسوس کرتا ہے، اس کی پسند وناپسند کا معیار اس کی اپنی شخصیت بن جاتی ہے، گلا، غیبت، دوسروں کو گرانے کی کوششیں، بے جا تنقید وغیرہ یہ ساری چیزیں خودپسندی ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں، معاصر شخصیتوں کی تعریف سننے سے فرد کی شخصیت میں آگ سی لگ جاتی ہے، اگرچہ فرد بظاہر اس کا اظہار نہ کرے، لیکن وہ اپنی مجلس میں معاصر شخصیتوں کی تعریف سننے کا روادار نہیں ہوتا، اس طرح کی صورتحال میں وہ ان کی خامیوں اور کوتاہیوں کو سامنے لانے کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔

خودپسندی پر مشتمل معاشرہ انتشار، ٹوٹ پھوٹ اور تصادم کا شکار ہوتا ہے، اس طرح کے معاشرہ میں اتحاد ووحدت پیدا ہونے نہیں پاتی، اس لئے کہ فردوافراد خود پسندی سے دستبردار ہونے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہوتے۔

خود پسندی مذہبی اور غیرمذہبی سب لوگوں میں موجود ہوتی ہے، خود پسندی جیسی ہولناک بیماری سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ خود احتسابی سے کام لیا جائے اور اندر میں ڈوب کر اپنی اس بیماری کا ادراک حاصل کیا جائے اور اس سے بچاؤ کے لئے مسلسل خوداحتسابی سے کام لیا جائے۔

جماعتوں میں انتشار ہو یا خاندانوں میں، وہ سب خودپسندی ہی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ فرد وافراد اپنی شخصیت کی افضلیت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں، خودپسندی کی بیماری کی موجودگی میں قوم وملت کی زندگی کا ہر شعبہ بحران وانتشار سے دوچار ہوتا ہے۔

ہمیں ملت کی حالت زار پر رحم کھاتے ہوئے اس روحانی بیماری سے نجات کے لئے کوشاں ہونا چاہئے۔

(۲۴) افراد معاشرہ کو دینی اور اخلاقی طور پر سہارا دینے اور سلیقۂ انسانیت سے بہرہ ور کرنے کے لئے دعوتی کام کی سخت ضرورت ہے، باطل نظریات اور باطل تہذیب کے علمبردار پوری قوت اور سارے وسائل کے ساتھ اپنا دعوتی کام کررہے ہیں اور اللہ حقیقی کی عبادت واطاعت کی بجائے خواہشات کی پیروی کے لئے اکسا رہے ہیں، جب کہ حق کے علمبرداروں کا کام سست رفتاری کا شکار ہے۔

افراد کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ خلا میں نہیں رہتے، یا تو وہ نفس پرستی اور مادیت پرستی پر مشتمل دعوت سے متاثر ہوتے ہیں، یا حق وصداقت کی دعوت سے، جو دعوت جس قوت اور زور وشور کے ساتھ پیش ہوگی افراد معاشرہ اسی کا حصہ بنتے رہتے ہیں، اس دور میں بالخصوص جب کہ باطل نظریات کو عالمی سرمایہ دار کی سرپرستی حاصل ہے، اس وقت اسلام کے دعوتی کام کے لئے طاقتور دینی جذبہ اور روحانی قوت کی ضرورت ہے، اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلانے کا کام ایسا ہے، جو انبیاء کرام کا کام ہے، اس کام کے لئے حکمت وبصیرت واستقامت اور اللہ پر کامل یقین کی ضرورت ہے۔

دعوتی کام کے لئے ملت کی سطح پر منصوبہ بندی کے بغیر یہ امید رکھنا کہ افرادِ معاشرہ کو مادی خوشحالی اورجنس اور پیٹ پرستی پر مشتمل نظریات کی رَو میں بچایا جا سکتا ہے، ممکن نہیں۔

مادی تہذیب نے لاکھوں مسلمانوں کو مغربی تہذیب کا حصہ بنا دیا ہے، یہ سب نتیجہ ہے دعوتی کام کے لئے وقت کے چیلنج اور اس کی نوعیت کو سمجھکر صحیح خطوط پر کام کے فقدان کا، حضور ﷺ نے دعوتی کام کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ صبح یا شام کا وقت دعوتی کام میں صرف کرنا دنیا اور جو کچھ اس میں ہے، ان سب سے افضل ہے۔

لیکن یہ اس دعوتی کام کے بارے میں ہے، جس میں اخلاص، للھیت بے نفسی، بہتر حکمت عملی اور دل سوزی وغیرہ شامل ہو۔

(۲۵) ایک فرد جو باطنی بیماریوں سے مغلوب ہوتا ہے، وہ نادانی سے ملت کی تباہی کا سامان کر رہا ہوتا ہے، اگر معاشرے کے مؤثر طبقات ان بیماریوں میں مبتلا ہوجائیں تو معاشرہ ہولناک فساد سے دوچار ہوجاتا ہے، ایسے معاشرے میں باہمی رسا کشی عروج پر ہوتی ہے، لوگ ایک دوسرے کے جان کے درپے ہوجاتے ہیں، قومی خزانہ خالی ہوجاتا ہے، ملک وملت افلاس کا شکار ہوجاتی ہے، ایک فیصد افراد دولت سے کھیل رہے ہوتے ہیں، اجتماعی ملی زندگی جسے ملی جسد کہنا چاہئے، وہ خونِ فاسد سے عبارت ہوجاتی ہے۔

داخلی وباطنی بیماریوں کی موجودگی میں کوئی بھی قوم نئے نئے بحرانوں سے بچ نہیں سکتی، ایسی قوم وملت کی انفرادی واجتماعی زندگی جس قدر بھی فساد سے دوچار ہوکم ہے، کوئی قانون اور عدلیہ کا کوئی فیصلہ اس طرح کی ملت کو زوال اور بحرانوں سے بچانے میں قابل ذکر کردار ادانہیں کرسکتا، اس لئے کہ جو قوم اندر سے بدلنے اور باطنی بتوں کی پرستش سے دستبردار ہونے کے لئے تیار ہی نہ ہو، اسے خارجی فیصلوں سے نہیں بدلا جا سکتا، "**ان اللہ لایغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم**" (بے شک اللہ تعالیٰ اس قوم کی حالت کونہیں بدلتا جو اپنے آپ کو بدلنے کے لئے تیار نہ ہو)۔

اگر ہم واقعتاً قوموں کی دنیا میں بہتر قوم کی حیثیت سے زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے آپ کو اندر سے بدلنا ہوگا، باطن میں تبدیلی برپا کرنی ہوگی، نفس پرستی کے بتوں سے نجات حاصل کرنا ہوگی، ورنہ دنیا وآخرت میں سوائے خسارہ کے کچھ بھی نہ ہوگا۔

(۲۶) سلیقۂ انسانیت سے محرومی کے حوالے سے حالات کا رونا رونا صحیح طرز عمل نہیں، ضرورت ہے کہ معاشرے کو بدلنے کے سلسلہ میں اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنے حصہ کا کردار ادا کیا جائے۔

اللہ کی تائید انہی لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے، جو ہر طرح کے حالات میں دعوت حق کے فروغ کے لئے مصروف کار ہوتے ہیں **ان تنصر اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم** (اگرتم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا)۔

حالات کا رونا روتے رہنا، یہ بے بسی کی علامت ہے اور خوداعتمادی سے محرومی کی بھی، جو بندہ مومن کے شایان شان نہیں، بندہ مومن کا وقت قیمتی ہوتا ہے، جو لاحاصل تبصروں اور تجزیوں میں صرف نہیں ہوتا۔

ویسے بھی باتیں کرتے رہنا کوئی کمال نہیں، حالات کو بدلنے کے سلسلہ میں کردار ادا کرنا ہی اصل جواں مردی ہے۔

(۲۷) معاشرے کو سلیقہ انسانیت سے آراستہ کرنے کے لئے داعیانہ کردار کی ضرورت ہے، داعی کے کچھ اوصاف یہ ہونے چاہئے۔

اس کی دعوت کا مرکز رجوع الی اللہ ہونا چاہئے، رجوع الی اللہ سے متعلق جو بھی مسائل ہیں، فکر آخرت اور اللہ کی محبت وغیرہ یہ ساری چیزیں اس کی دعوت کا حصہ ہونا چاہئے۔

داعی کی ایک صفت یہ ہونی چاہئے کہ اسے مثبت طور پر اپنی بات پیش کرنی چاہئے، لوگوں سے الجھنے سے ہر قیمت پر بچنا چاہئے، نیز مخالفت کو آخری حد تک برداشت کرنے کا حوصلہ اور ظرف پیدا کرنا چاہئے، داعی کی دوسری صفت یہ ہونی چاہئے کہ اس کے دل میں مدعو کے لئے شفقت ومحبت ہونی چاہئے، اس کی گفتگو میں دل سوزی ہونی چاہئے۔

داعی کو اپنے دور کے حالات، وقت کے چیلنج، لوگوں کے مزاج اور ذہنیت کو پیش نظر رکھکر، دعوتی کام کرنا چاہئے، تقریر اور گفتگو کو طول دینے سے بچنا چاہئے، اس لئے کہ طویل گفتگو سے بیزاری پیدا ہوتی ہے۔

داعی کو اپنی ذاتی تحقیق پر اعتماد کرنے کی بجائے ربانی علما کی سرپرستی میں کام کرنا چاہئے، اس سے اس کے کام میں برکت ظاہر ہوگی۔

داعی کو اپنے دور کے فتنوں سے پوری طرح واقف ہونا چاہئے اور ان فتنوں سے لوگوں کو بچانے کے لئے کوشاں ہونا چاہئے۔

(۲۸) آزادی کے اس دور میں اکثر افراد کو شکایت ہے کہ وہ مخالف جنس کو دیکھتے ہوئے آنکھوں کی حفاظت کرنے میں ناکام ہیں اور پھر اس کے نتیجہ میں ذہن، مخالف جنس کے بارے میں خیالات کے تلاطم میں مبتلا ہونے لگتا ہے۔

یہ شکایت دراصل کم تر حسن سے مسحور ہونے کا نتیجہ ہے، فرد جب حقیقی حسن سے فیضیاب ہوتا ہے تو کم تر حسن سے آسانی سے دستبرداری ہونے لگتی ہے، حقیقی حسن سے فیضیابی کیا ہے؟ کثرت ذکر کے ذریعہ محبوب حقیقی سے تعلقات کا استحکام، اس سے محبوب کے انوار حسن سے بہرہ وری ہوتی ہے تو پھر طالب ان انوارحسن میں کھوجاتا ہے، اس طرح مادی حسن اسے فریب دینے میں ناکام ہوجاتا ہے۔

کتنے ہی بڑے مادی حسن سے سابقہ ہو، کثرت ذکر میں پوشیدہ اجزائے حسن سے فرد کی شخصیت اس طرح مسحور ہوتی ہے کہ مادی حسن کی طرف توجہ مبذول ہونے نہیں پاتی۔

یہ ایسا تجربہ ہے، جو کثرت ذکر کرنے والے افراد کا عملی مشاہدہ ہے، اللہ تعالی مجھ جیسے سیہ کار کو بھی ایسے خوش نصیب افراد میں شامل فرمائے۔ (آمین)

(۲۹) قرآن واحادیث کی تین حیثیتیں ہیں، جن کو سمجھنا از حد ضروری ہے، ان کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ صحیح صحیح الفاظ ہم تک منتقل ہوئے ہیں، قرآن واحادیث کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ اس کے معنیٰ اور مفہوم حضورﷺ ، صحابہ کرام اور سلف صالحین سے پورے تواتر وتسلسل کے ساتھ ہم تک پہنچے ہیں، قرآن وسنت کی تیسری حیثیت یہ ہے کہ ان میں موجود نور بصیرت صحبت کے ذریعہ ہم تک منتقل ہوا ہے۔

جب تک ان تین چیزوں کے قابل ذکر اجزا حاصل نہ ہوں گے، تب تک قرآن وسنت کی روح، اس کی حقیقت واصلیت اور ان میں موجود نور بصیرت تک رسائی حاصل نہ ہو سکے گی۔

ان تینوں علوم کے حصول کے بغیر قرآن وسنت کی جو تشریح ہوگی، وہ نقائص کے بغیر رہ نہیں سکے گی، اس تشریح سے امت میں نئے نئے گروہ پیدا ہوتے رہیں گے، جو سلف کی تشریح اسلام کو غلط اور اپنی تشریح اسلام کو صحیح سمجھنے کے مزاج کے حامل ہوں گے، اس طرح کے تشریح اسلام کے حامل افراد کے مزاج کی تشکیل میں آداب انسانیت، سلیقہ انسانیت اور تزکیہ کا بھی سخت فقدان موجود ہوگا۔

(۳۰) اس وقت مسلم معاشروں کو سب سے زیادہ خطرہ مادہ پرست مغربی تہذیب سے ہے، جس کی بنیاد ماڈرن ازم (مادر پدر آزادی) اور سیکولرازم (نفس کے یرغمال شدہ عقل) پر ہے، یہ تہذیب انسان کو ترقی یافتہ حیوان سمجھکر، اس کی حیوانیت اور بہیمت کو فروغ دینے کے لئے کوشاں ہے اور انسان سے اس کے پاکیزہ اوصاف، پاکیزہ اخلاقی قدریں (جو مذہب اور وحی کا دَین ہوتی ہیں) سلب کرنا چاہتی ہے، بلکہ بڑی حد تک سلب کر چکی ہے۔

اس تہذیب کا مرکز امریکہ ہے، امریکہ میں اس تہذیب کے پیدا کردہ تباہ کن اثرات کے موضوع پر ایک امریکی مصنف نے بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جو ہماری آنکھیں کھولنے کے کافی ہے، اس لئے کہ ہم تیزی سے مغرب سے مرعوبیت اور اس کی نقالی کی راہ پر گامزن ہیں۔

یہ امریکی مصنف امریکہ کی سپریم کورٹ کے ایک ریٹائر جج لابرٹ ایچ بارک صاحب ہیں، کتاب کا نام ہے **Slouching Towards Gomorrah** (یعنی قوم لوط علیہ السلام) جیسے انجام کی طرف لپکتا ہوا معاشرہ)۔ لکھتے ہیں۔

’آج کی مغربی تہذیب‘ کو (دشمن کی طرف سے) کسی جنگ کا خطرہ نہیں۔ سوویٹ روس اور جرمنی کے ’نازی‘ بے حقیقت ہیں اور نہ ہی یہ خطرہ بیرونی ہے۔ یورپ سے تاتاری (سلطان محمد فاتح، فاتح قسطنطنیہ ومشرقی یورپ اور طارق بن زیاد کے ساتھ شمالی افریقہ کے جنگجو مسلمان) فوجوں کو صدیاں گزریں، واپس بھیجا جا چکا ہے۔ (تاریخ کے اس موڑ پر) اگر ہم دور حاضر کی ترقی اور ٹیکنالوجی کے باوجود جدید DARK AGES میں پہنچ گئے تو یہ (اپنے ساتھ) ہمارا خود کردہ عمل ہوگا، نہ کہ باہر کی کسی ماضی کی طرح کی فوجوں کی کارروائی کا نتیجہ۔ اس دفعہ یہ (مہیب) خطرہ جو (تہذیب حاضر پر) حملہ آور ہوچکا ہے، وہ ہماری تہذیب کے اندر مضمر ہے اور غالبا یہ ہماری (بے بنیاد اور خدا بیزار) تہذیب کا اپنا فطری نتیجہ۔

امریکہ میں یقیناً (نفسیاتی) خوف وہراس کا ایسا دور پہلے کبھی نہیں آیا، جیسا آج درپیش ہے۔ جس کے جلو میں ’فرد‘ کی سطح پر (قدم قدم پر) مصیبتیں (ہی مصیبتیں) ہیں، جو اب ایک معمول بن گئی ہیں۔ جرائم کا گراف اوپر جارہا ہے اور سزائیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بغیر شادی کے (عورتوں کے ہاں) بچوں کی پیدائش کا شمار ہر سال لاکھوں میں ہے، جنھیں ویلفیئر کا سہارا ملتا ہے، جبکہ بلاوجہ ’طلاق‘ کی شرح آسمان سے باتیں کررہی ہے۔ یہ روگ ماضی قریب کے ہیں اور اب یہ بات تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں آپس میں لازم وملزوم

ہیں۔ یہ روگ (دھوکے میں آزادی اور ترقی سمجھ کر) گلے لگانا آسان تھا، اب اس سے (صحیح سلامت) نکل آنا ممکن نہیں ہے۔ درحقیقت ابھی تک کوئی پختہ رائے نہیں بن سکی کہ اس کا علاج کیا ہے؟ اور اگر ہم کسی رائے تک پہنچ بھی جائیں تو دور حاضر کی جمہوری حکومتیں شاید وہ تادیبی اقدامات کر ہی نہ سکیں، جو ضروری ہیں۔

(ان حالات میں) مایوس کن تجزیوں کی بڑی گنجائش ہے۔ تاہم امید کی کرن بھی موجود ہے۔ (زیادہ تر) تجزیے بتاتے ہیں کہ ہم تیزی سے 'عامورا' (جیسی تباہی) کی طرف لڑھک رہے ہیں اور عین اس 'اخلاقی زوال' کی شاہراہ پر ہیں۔ عہد حاضر کے لبرل ازم نے ہمارے معاشرے کو اوپر کی سطح پر کرپٹ کر دیا ہے۔

ایک طرف اس بات کے کہنے والے امریکی بہت ہیں کہ ہمیں جتنا نیکی کا پرچار کرنا چاہیے، اتنا نہیں کرتے۔ دوسری طرف اس بات کے ثبوت بھی کم نہیں کہ اکثر امریکی خود پسندی اور ذاتی لذت کوشی کے ہولناک اثرات کی وجہ سے (انتہائی) بے چینی سے دوچار ہیں اور اس کے سبب ہم (بحیثیت قوم) 'عامورا' (جیسی تباہی) کے کنارے آں پہنچے ہیں (جہاں ذاتی لذت کوشی کے سوا کسی کو کسی کی کوئی فکر نہیں ہے) جس کا لامحالہ فوری 'تحفہ' یہ ہے کہ (امریکی تہذیب پر) بڑھتے ہوئے جاہلانہ رویے، شدت پسندی، مایوسی اور خودغرضانہ سوچ کے گہرے سائے ہیں۔

(جہاں تک اصلاحی تدابیر کا تعلق ہے) پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ہم (ٹھنڈے دل سے) غور کریں کہ ہمارے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟ اس کتاب میں اس سوال کا جواب تلاش کر کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ زوال اور تنزل کے اثرات معاشرے کے ہر طبقے میں ہیں اور اس زوال کی واحد اور مشترکہ وجہ 'لبرل ازم' (یعنی مادر پدر آزادی) کی سوچ ہے۔

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ لبرل ازم (مادر پدر آزادی) اور خالص ایگالیٹرزنم (ذاتی خود غرضانہ زندگی) کی ہر محاذ پر (سخت) مزاحمت کا رویہ۔ یہ سوال بے جا ہے کہ کوئی ایک حل ہونا چاہیے۔ یقیناً کوئی ایک بڑی یک رُخی مہم اس کا علاج نہیں ہے، ہمیں ہر خرابی کے لئے (موقع بہ موقع) علیحدہ سوچ کا انداز اپنانا ہوگا۔ ہر 'چرچ' سے 'مذہب' کے احیاء کا نعرہ ضروری ہے۔ ہر یونیورسٹی اور سکول بورڈ کی سطح پر بھی (یعنی نعرہ ہو)۔ (اس لئے کہ آزادی کی بنا پر کسی کو فوری طور پر مذہب کے احیاء کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا)۔ (ریاستوں کی) انتظامیہ اور سرکاری ملازمین کو (مذہب کی) نکیل ڈالی جائے (اور اخلاق وکردار کا پابند بنایا جائے)۔

عدلیہ پر بھی گہری نگاہ رکھی جائے اور اپنے آئینی حدود سے تجاوز کے معاملات پر اس کی سخت تنقید کی جائے، جیسا کہ آج کل اکثر ہوتا ہے۔ (عوامی سطح کی) اس مہم میں کئی اقدامات کے لئے حکومت کا بھی سہارا لینا ناگزیر ہے، جیسا کہ ہماری مروجہ تہذیبی آزادیوں کے تحت 'غیر مہذب' طور طریقوں پر پابندیوں کا اجراء وغیرہ۔

(افسوس کہ) ہم نے خود امریکہ کے ذہنی سرمایہ اور سنہرے اخلاق اصولوں کی شدید توڑ پھوڑ کی، مجرمانہ چشم پوشی کی، اگر ہم جذبات سے بلند ہو کر سوچیں اور حقائق پہچانیں تو ہماری موجودہ روش کا نتیجہ، مایوسی کی فضا میں تو 'عامورا' (کی تباہی) سے مشابہ ہی نظر آئے گا۔ تاہم صورت حال لاعلاج نہیں ہے۔

ہمارے پاس (اس کم وقت میں) جو مہلت عمل ہے، اس میں ایک عزم مصمم کہ 'تباہی' ہمارا مقدر ہو، یہ ہمیں قبول نہیں اور اس کے لئے ایک (چٹان کا سا) عزم کہ ہم RESIST کریں گے اور ہمارے پاس یہی (قوموں کی) قوت اداری کی (گرانقدر) قوت ہے۔ **(بحوالہ حکمت بالغہ جھنگ نومبر ۲۰۱۸)**

(۳۱) پاکستانی ملت کو ایک ایسی قیادت کی ضرورت ہے، جو اجتماعی نظام کی تشکیل میں سلیقہ انسانیت کے کام کو نصب العین کی حیثیت سے اختیار کرے اور ملت کی رگوں میں نئے خون کی گردش کا باعث ہو، اس طرح کی قیادت ہی ہمارے مسائل کا حل ہے، ترکی کو اردغان کی صورت میں یہ قیادت مل چکی ہے، جو پچھلے بیس پچیس سال سے ترکی کی ملت کے رخ کو بدلنے اور اسلامی نصب العین سے قریب کرنے کے سلسلہ میں اپنی ساری توانائیاں صرف کر رہی ہے، پاکستانی ملت کو اس طرح کی قیادت مل سکتی ہے، شرط یہ ہے کہ ملت میں اس طرح کی قیادت کی طلب موجود ہو اور اپنی زندگی کے رخ کو صحتمند خطوط پر ڈالنے کی آرزو اور تمنا موجود ہو، آرزو، تمنا اور طلب کے نتیجہ میں ہی قوموں پر قدرت کی فیاضی ہوتی ہے اور قدرت اس طرح کی شخصیتیں عطا کر کے، انہیں زوال سے عروج کی طرف لاتی ہے، عدم طلب کی وجہ سے اگر اس طرح کی قیادت عطا بھی ہو تو ناقدری ہوتی ہے، جو مزید سزا کا

موجب ہوتی ہے۔

ہمارا کام یہ ہے کہ افراد معاشرہ میں اسلام سے ہمہ آہنگ پاکیزہ نصب العین کے لئے شعور کو بیدار کریں اور دل میں اس کی طلب اور تڑپ پیدا کریں، اللہ کی ذات بہت فیاض ہے، قوموں کے لئے اس کے نصرت کا قانون قوموں کی طلب سے وابستہ ہے، جو ملت سرے سے پاکیزہ نصب العین کو چاہتی ہی نہ ہو، اور اس کے لئے اس کے دل کے دروازے واہی نہ ہوں تو اس طرح کی قوم وملت قدرت کی فیاضیوں سے متمتع ہرگز نہیں ہوسکتی۔

پاکیزہ نصب العین کی حامل قیادت قدرت کا سب سے بڑا عطیہ ہے، یہ عطیہ ہر ایک کونہیں ملتا، قدرت کے اس عطیہ کا مستحق بننے کے لئے ملت کو اپنی زندگی کو بدلنے کے لئے تیار ہونا ہوگا اور اپنے آپ کو اس طرح کی قیادت کا اہل ثابت کرنا ہوگا۔

جب تک اس طرح کی قیادت عطا نہ ہو، دردمند دینی حلقوں کا کام یہ ہے کہ وہ افراد معاشرہ کے دل ودماغ کو بدلنے اور انفرادی واجتماعی زندگی کو بہتر خطوط ونقوش پر گامزن کرنے کے لئے آمادہ کریں، اگر یہ دعوتی کام معاشرے میں پوری قوت سے ہوتو معاشرے کی حالت میں تبدیلی آسکتی ہے اور ہم بہتر قیادت کے سایہ رحمت کے مصداق ہوسکتے ہیں۔

زوال پذیر قوموں کی یہ عجب خصوصیت ہوتی ہے کہ ان میں بُرائی کی دعوت قبول کرنے کی صلاحیت طاقتور ہوتی ہے، جب کہ خیر کے لئے نہ صرف یہ کہ طبعی آمادگی نہیں ہوتی، بلکہ اس دعوت سے ان کی طرف سے مزاحمانہ صورت پیدا ہوتی ہے، جو کسی بھی قوم وملت کے لئے سب سے بڑی تشویشناک بات ہوتی ہے۔

ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کہیں ہم اس تشویشناک حالت تک تو نہیں پہنچے؟ اگر ایسا ہے تو پھر بہتر قیادت کا خواب دیکھنا دشوار ہے، البتہ حقیقی داعیوں کا کام یہ ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات میں معاشرے میں خیر وشر کا شعور پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہوں اور اس میں اپنی ساری توانائیاں صرف کریں۔

(۳۲) بیسویں صدی میں غلبہ اسلام کے لئے ایک تحرک پیدا ہوئی، ایک پوری فکر دی گئی، جس سے احیائے اسلام اور نشاۃ اسلامیہ کا کافی کام ہوا اور عالمی استعمار نے اس تحرک کو اپنے لئے چیلنج بھی محسوس کیا اور احیائے اسلام کی تحریک کی روک تھام کی کوششیں بھی ہوئیں، لیکن غلبہ اسلام کی اس فکر میں بعض داخلی کمزوریاں ایسی رہیں، جس کی وجہ سے یہ تحریک معاشرے کو متحرک وفعال بنانے، اپنے حاملین کی قوتِ کارکردگی میں اضافہ کرنے اور ان کا تزکیہ کرنے میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی۔

اسلامی تحریک چونکہ پوری ملت کی تحریک ہوتی ہے، اس لئے معاشرے میں غلبہ اسلام کی تحریک کے حوالے سے کمزوریوں اور نقائص کو سمجھنے اور انہیں دور کرکے ازسرنو آگے بڑھنے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں تنقید سننے اور خود احتسابی کی سخت ضرورت ہوتی ہے، دوسری صورت میں یہ تحریک قیل وقال، کاغذی منصوبہ بندی اور ظاہری نوعیت کے بعض پروگراموں سے آگے نہ بڑھ سکے گی۔

ہماری نظر میں اس فکر اور تحریک کی بعض کمزوریاں درج ذیل ہیں۔ ان کمزوریوں کی نشاندہی جذبہ محبت سے کی جارہی ہے، مقصود غلبہ اسلام کی تحریک کا فروغ ہے، جو اپنی غلطیوں کی تشخیص اور خوداحتسابی سے ہی ممکن ہے۔

- دماغ مسلمان ہوتا ہے، دل کی عشق ومحبت کی صلاحیتیں کم ہی بیدار ہو پاتی ہیں۔
- اسلام کے لئے فکر مندی اور منصوبہ بندی زیادہ ہوتی ہے، جب کہ اپنے حصہ کے کردار کی بہتر ادائیگی کی صورت کم ہی پیدا ہوتی ہے۔
- ذکر وفکر اور عبادت سے شغف اور رغبت نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے قلبی سکوں سے محرومی ہوتی ہے۔
- تنقیدی مزاج غالب ہوجاتا ہے، بالخصوص علمائے ربانیین تنقید کا زیادہ نشانہ بنتے ہیں۔
- آپس میں ایک دوسرے سے محبت پیدا ہونے اور ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف کرنے کی بجائے ایک دوسرے سے رنجیدگی، تلخی، شکوہ شکایت اور عدم برداشت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔
- مثالیت پسندی کا غلبہ ہوتا ہے، اس لئے بہت زیادہ کام ہاتھ میں لیں گے، جب کہ کام کا معمولی حصہ بھی ادا کرنے سے قاصر ہوں گے۔
- دل کے لطیف احساسات سے محرومی کی وجہ سے انسانی نفسیات کے بنیادی حقائق سے ناآشنائی ہوتی ہے، دوسرے الفاظ میں دل کی صلاحیتوں پر عقل غالب ہوتی ہے، جوفرد کو

قیل وقال سے آگے بڑھنے نہیں دیتی۔

• اسلام کو زبان اور میڈیا کے ذریعہ غالب کرنے کا میلان غالب ہے، جب کہ اپنی ذات پر اسلام کو نافذ کرنے کے کام سے پہلو تہی ہے۔

• عبادت اور ذکر وفکر سے طبعی میلان نہ ہونے، اور اہل اللہ پر تنقید کے غلبہ کی وجہ سے دل انوار سے خالی ہوتا ہے، اس لئے اجتماعیت انتشار کا شکار رہتی ہے اور کام میں برکت نہیں ہوتی۔

• جب فکر میں اللہ سے والہانہ محبت کے جذبات کو بیدار کرنے کے کام کو اہمیت حاصل نہ ہوگی تو اس سے دل وذہن کے درمیان تضاد اور بُعد پیدا ہوگا، جس سے دل کی حسیں اور اس کے سوتے خشک ہوجائیں گے اور اسلام کے لئے متوازن قسم کے افراد پیدا ہونے میں ناکامی ہوگی۔

• یہ نکتہ نظر انداز ہوا ہے کہ ذاتی اصلاح اور تزکیہ کا کام سب سے زیادہ ترجیح کا مستحق ہے، چونکہ ہر انسان میں موجود نفس کی قوت عام طور پر فرعون کی قوت سے مشابہت رکھتی ہے، اس لئے فرعون نفس کے تزکیہ کے بغیر غلبہ دین اور اقامت دین کا کام باہمی اختلافات اور مزاج کی سختی کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(۳۳) جدید اسلامی فکر میں مذکورہ کمزور پہلوؤں کا بنیادی سبب یہ ہے کہ غلبہ دین کی فکروتحریک میں سلف صالحین کی اسلامی فکر سے بھرپورہ استفادہ نہیں کیا گیا اور غلبہ دین کی تحریک کو دل کی عشق کی صلاحیتوں کی بیداری کے بجائے عقلیت کی بنیادوں پر کھڑا کیا گیا۔

غلبہ دین کی جدید تحریک کو ان نکات کو پیش نظر رکھکر ، جہاں جدید علمی، فکری اور عملی چیلنج کے مقابلہ کی تیاری کا کام کرنا ہوگا، وہاں دل اور عقل دونوں کی صلاحیتوں کی بیداری میں توازن سے کام لینا ہوگا اور حمیت دین کی حسوں کی بیداری ساتھ ساتھ اللہ سے محبت کے نصب العین کو بھی فیصلہ کن اہمیت دینا ہوگا۔

دوسری صورت میں بظاہر تو غلبہ دین کی جدوجہد کا کام ہوگا، لیکن عملاً تزکیہ اور تہذیب نفس سے دوری کی صورتحال پیدا ہوتی جائے گی اور اللہ سے محبت کے نصب العین کی بات سنتے ہی طبیعت میں وحشت وبیزاری کی حالت پیدا ہوگی۔

اس دور کے ممتاز اسلامی فلاسفر ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی ساری فکر اسلامی محبت کے نصب العین کے گرد ہی گھومتی ہے، انہوں نے اس موضوع پر ہزارہا صفحات لکھے ہیں اور لکھا ہے کہ انسانی فطرت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ اپنے محبوب سے والہانہ محبت کرے اور اس محبت کو ارتقائی صورت دیتا رہے، اس محبت سے ہی اس کے سارے جذبات کی تسکین کی صورت وابستہ ہے اور محبوب کی مرضی کو اپنی داخلی شخصیت اور خارجی زندگی میں نافذ کرنے کی اصل کلید بھی یہی ہے۔

اللہ کی محبت ہی یہ طے کرتی ہے کہ فرد کی توانائیوں اور جدوجہد کی کتنی مقدار داخلی زندگی کی تعمیر میں صرف ہونی چاہئے اور کتنی مقدار خارجی جدوجہد میں۔ نیز جب محبت کی یہ مقدار بڑی حد تک فردوافراد میں پیدا ہوجاتی ہے تو اس کے بعد خارج کا رخ اختیار کرتی ہے اس کے بعد یہ محبت خارجی باطل سے صف آرا ہونے میں صرف ہوتی ہے، اس لئے کہ اب داخلی باطل بڑی حد تک مطیع ہوگیا ہے۔

(۳۴) سلیقہ انسانیت کے ہمہ گیر وہمہ جہتی بحران کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اس دور میں باطنی بیماریوں کا ادراک بالکل سلب ہوگیا ہے، جب باطن فساد سے بھرا ہوا ہو تو ظاہر ہے باطنی جذبات واحساسات سے جو اعمال صادر ہوں گے، وہ فساد ہی کا موجب ہوں گے، جس طرح جسمانی بیماریاں جب سنگین ہوجائیں تو فردوافراد کی موت واقع ہوجاتی ہے، اسی طرح باطنی اور روحانی بیماریاں جب انتہا کو پہنچ جائیں تو انسانیت موت کے سے منظر سے دوچار ہونے لگتی ہے جب فردوافراد کو جسمانی بیماریاں لاحق ہونے لگتی ہیں تو وہ فوری طور پر اچھے سے اچھے معالج کی طرف رجوع ہوتا ہے، اور ان بیماریوں کے علاج کی فکرمندی میں لگ جاتا ہے، لیکن باطنی اور روحانی بیماریوں کے بارے میں ہماری روش بے حسی کی سی ہے کہ ساری باطنی بیماریوں میں مبتلا ہونے کے باوجود ہم اپنے آپ کو صحتمندوں میں شمار کرنے لگتے ہیں، باطنی بیماریوں کے بارے میں بے حسی کی اس اجتماعی روش نے ہی ہماری اجتماعی قومی زندگی کو ہولناک فساد سے دوچار کردیا ہے، باطنی بیماریوں میں حب جاہ، حب مال، حرص وہوس، حسد، جلن، دوسروں کی تحقیر، اپنی فوقیت کا داعیہ، اشتعال کی نفسیات، جذبہ شہرت وغیرہ شامل ہیں، ان میں سے ہر بیماری ایسی ہے، جو افراد کی ہلاکت کے لئے کافی ہے، ہمارا معاشرہ انہی

بیماریوں کے نتائج بھگت رہا ہے کہ اجتماعی زندگی کی کوئی کل درست نہیں۔

ظاہری اعمال دراصل باطن کے حالات ہی کا عکاس ہوتے ہیں، باطن جس قسم کے جذبات واحساسات سے عبارت ہوگا، خارجی واجتماعی زندگی میں اسی طرح کے اعمال ظاہر ہوں گے۔

باطنی بیماریوں کی سنگینی کا اندازہ اللہ کے رسولﷺ کی درج ذیل احادیث سے لگایا جا سکتا ہے۔

آپؐ نے فرمایا،جس فرد میں ذرہ برابر بھی تکبر موجود ہوگا، وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔

آپﷺ نے دوسری حدیث میں فرمایا کہ دنیا کی محبت ساری بُرائیوں کی جڑ ہے، یعنی جس شخص میں دنیا کی محبت موجود ہوگی، وہ ہرطرح کی بُرائیوں سے دوچار ہوسکتا ہے۔

آپﷺ نے فرمایا، حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے، جس طرح آگ لکڑیوں کو۔

آپؐ نے فرمایا کسی دل میں ایمان اور حسد جمع نہیں ہو سکتے، پہلی قوموں میں حسد اور باہمی دشمنیاں پیدا ہوجاتی تھیں۔ آپﷺ نے فرمایا جوشخص نرمی کی صفت سے محروم کیا گیا، وہ سارے خیر سے محروم ہوا، دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ اگر نرمی کی کوئی صورت ہوتی تو وہ دنیا کی سب سے بہتر صورت ہوگی، اگرسختی کی کوئی شکل ہوتی تو وہ سب سے بدشکل ہوتی۔

آپﷺ نے دنیا کے بارے میں فرمایا دنیا جس طبقہ میں بھی آئے گی اللہ تعالیٰ ان میں دشمنی اوربغض پیدا فرمائیں گے۔

آپﷺ نے فرمایا جوشخص لوگوں کو سنانے کے لئے کوئی عمل کرے گا تاکہ اس کو شہرت حاصل ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے عیب کومشہور کرے گا اور قیامت کے دن اسے رسوا کرے گا۔

آپﷺ نے فرمایا، مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خطرہ شرک اصغر کے بارے میں ہے، صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ شرک اصغر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ریا، آپ ﷺ نے فرمایا جس نے علم کو غیر خدا کے واسطے حاصل کیا اور جس نے علم کے ذریعہ غیر اللہ کی رضا جوئی کا ارادہ کیا تو اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں تلاش کرے۔

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ جس نے علم اس غرض سے حاصل کیا کہ اہل علم کے درمیان فخر وعزت حاصل کرے اور بےعلموں کا ناطہ بند کرے اور لوگوں میں نام ونمود حاصل کرے تو اسے اللہ جہنم میں داخل کرے گا۔

یہ باطنی بیماریاں ہیں، جس کے اثرات ونتائج بھی اللہ کے رسولﷺ نے واضح فرما دیئے، لیکن عقلیت اورنفسانیت کے غلبہ کی وجہ سے افراد معاشرہ سے سرے سے باطنی بیماریوں کا ادراک ہی سلب ہوگیا ہے، جو اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے اور افراد معاشرہ کو سلیقہ انسانیت سے بہرہ وری کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

(۳۵) سلیقہ انسانیت کے بڑھتے ہوئے بحران کا سب سے بڑا سبب (جس کا ہم نے بار بار ذکر کیا ہے) یہ ہے کہ ہم نے مادہ پرست قوموں کے نظام تعلیم کو اختیار کرکے، اپنی نسلوں کو مادہ پرست قوموں کی تہذیب کے نذر کر دیا ہے، جو نظام تعلیم مادی زندگی اور اس زندگی کے مستقبل ہی کو سب کچھ سمجھتا ہو، اس نظام تعلیم پر فریفتہ ہونا اور اپنی نسلوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ فنی تعلیم دینے کی خاطر اسے مادہ پرست طرز فکر کے حامل اداروں وافراد کے حوالے کرنا، یہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے، ہمارے دیندار افراد کی بھی یہی حالت ہے کہ وہ اپنی اولاد کی چند دنوں کی زندگی کی خوشحالی کی خاطر انہیں دینی تعلیم سے بالکل عاری مغربی تعلیم دلانے اور اس کی ڈگریوں کے حصول کے لئے بہت زیادہ متفکرومضطرب ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ جدید نوعیت کے تعلیمی اداروں سے دولت ودنیا پر فدا ہونے اور مادی زندگی کو نصب العین بنانے والے افراد کثرت سے پیدا ہورہے ہیں۔

اگر رواجی یا معاشی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم اور پاکیزہ اخلاقی تربیت کا اہتمام ہوتا پھر تو جدید تعلیم سے خیر کے پہلو برآمد ہو سکتے تھے، لیکن ایسا نہ ہونے کی وجہ سے جدید تعلیمی اداروں سے آخرت آشنا افراد پیدا ہونے کی بجائے دنیا آشنا افراد ہی پیدا ہورہے ہیں۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس سلسلہ میں اہم نکتہ بیان فرمایا ہے، لکھتے ہیں:

’’قوموں کے اجتماعی فیصلوں نے دنیا کے نقشے اور قوموں کی تقدیریں بدل دی ہیں،

آج جس چیز کی ہم کو سب سے زیادہ ضرورت ہے اور جو تمام موانع اور رکاوٹوں پر غالب آسکتی ہے، اور جس کے سامنے حالات کو سپر ڈالنی پڑے گی، وہ ہمارا یہ فیصلہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کی دینی تعلیم کو ہر تعلیم پر مقدم رکھیں گے اور بغیر اس ضروری دینی تعلیم کے جس سے وہ اپنے پیدا کرنے والے کو، اپنے پیغمبر (ﷺ) کو اور اپنے عقیدے اور فرائض دینی کو پہچان سکیں، خالص (مذہب بیزار) رواجی یا معاشی تعلیم دلانا گناہ اور اپنے مذہب سے بغاوت سمجھیں گے، اگر ہمارا یہ فیصلہ ہے اور ہم اس میں سچے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی ترغیب، کوئی مصلحت، کوئی تعزیر ہم کو اس صراط مستقیم سے ہٹا نہیں سکتی اور ہماری نسلوں کو اسلام کی نعمت سے محروم نہیں کرسکتی، اور اگر ہمارا یہ فیصلہ نہیں تو حکومت کی کوئی رعایت، کوئی استثناء، کوئی تحفظ، کوئی انتظام، ہم کو اس فساد والحاد اور اس انحراف وارتداد سے بچا نہیں سکتا، جس کی طرف دنیا تیزی سے بڑھ رہی ہے، جو قومیں اپنے بارے میں خود فیصلہ نہ کرسکیں، ان کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔''

(۳۶) سلیقہ انسانیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ باطل نصب العینوں کی محبت ہے، جو فردوافراد اور معاشرے کے فساد کا سبب بنتی ہے، باطل نصب العین میں دنیا کی محبت کا باطل نصب العین بھی شامل ہے۔

جب تک اللہ کی محبت کا نصب العین، ارتقاء پذیر ہوکر، دل کے سارے حصوں اور گوشوں پر محیط نہیں ہوتا، تب تک باطل نصب العینوں کی محبت کا داعیہ مچلتا رہے گا اور فرد وافراد خطرے کی حالت سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، اس لئے دیکھا گیا ہے کہ حصول معاش کی غیرمعمولی سرگرمیاں اکثر افراد کو باطل نصب العین میں مستغرق کرنے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہیں۔

دنیا دار افراد ہی نہیں، بلکہ دیندار افراد بھی اگر نفس سے شدید معرکہ آرائی کرکے، باطل نصب العین سے پوری طرح گلو خلاصی حاصل کرنے سے پہلے معاشی سرگرمیوں میں بہت زیادہ مصروف ہوجاتے ہیں تو یہ معاشی جدوجہد ان کے لئے بھی باطل نصب العین سے رغبت کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ دل کے سارے گوشے اور حصے اللہ کی محبت کے نصب العین سے منور اور تابناک نہیں ہوئے ہوتے اور باطل نصب العین کے کچھ اجزاء دل کی گہرائیوں میں موجزن ہوتے ہیں، جو افراد کے لئے اللہ کی محبت کی راہ میں شدید مزاحم ثابت ہوتے ہیں۔

ولاتمدن عینیک الیٰ مامتعنا به ازواجا منهم زحرة الحیواة الدنیا لنفتنهم (اور ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ جن میں کئی طرح کے لوگوں کو ہم نے دنیا کی زندگی میں آزمائش کی خاطر آسائش کا سامان دیا ہے۔)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی آسائش اور رونق کی چیزیں آزمائش ہیں۔ ایسے افراد جن کو اس آزمائش میں مبتلا کیا گیا ہے، ان سے دوستی اور تعلقات کا استحکام تو کیا، ان کی طرف حسرت سے دیکھنا بھی خطرہ سے خالی نہیں، اس دور میں بزرگی کے نام پر متعدد افراد نے اس قرآنی اصول کی خلاف ورزی کی، نتیجۃً وہ بزرگی کی صورت و پردے میں غلط نصب العین کی نذر ہوگئے اور ان سے یہ ادراک ہی سلب ہوگیا کہ سرمایہ دارانہ طرز زندگی اسلام کے مزاج کے منافی ہے۔

اگر مالداروں کی طرز زندگی اور مادی خوشحالی قابل ستائش بات ہوتی تو قرآن ایسے افراد کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے سے باز رہنے کی تاکید نہ کرتا۔

(۳۷) ہماری نئی نسل کو جو ماحول ملا ہے، وہ مادی حسن پر فدائیت کا ماحول ہے، آپ نوجوانوں کی کسی بھی محفل ونشست میں شامل ہوں، وہاں آپ کو اکثر نوجوان موبائل کھول کر اس میں اس طرح مگن ہوتے ہوئے نظر آئیں گے کہ انہیں اردگرد کا ہوش ہی باقی نہیں ہوتا۔ دنیا بھر کے مادی نوعیت کے مناظر حسن سے متمتع ہونے کے لئے وہ حالت مراقبہ میں ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مادی حسن پر فدائیت کی اس روش نے نوجوان نسل کو ہمہ گیر وہمہ جہتی بحران سے دوچار کردیا ہے۔ نیکی کی راہ میں قدم بڑھانا ان کے لئے دشوار ہوگیا ہے، ذہنی اور قلبی سکون ان سے رخصت ہوگیا ہے۔ خود اعتمادی سے محرومی ہوگئی ہے، خیر وشر کی پہچان ختم ہوگئی ہے، ہر وقت مادی حسن پر فدائیت کی ادائیں اور اس کی سوچ غالب ہوگئی ہے، اپنی پاکیزہ تہذیب کے حوالے سے بات سننے کی صلاحیت مفقود ہوگئی ہے، مادی حسن اور خوشحال مادی زندگی کے علاوہ کوئی فکر باقی نہیں ہے۔

یہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے، جو ہماری نئی نسل کے ساتھ ہوا ہے، اسی سے سلیقہ انسانیت کا بحران پیدا ہوا ہے۔

(۳۸) مغربی فکر اور مغربی تہذیب کے زیر اثر جدید انسان کی منزل ومقصود دنیا میں لامحدود مسرت کا حصول ہے، سائنسی اور ٹیکنالوجی کی ترقی، مرد وعورت کی آزادی اور عورت کا بے لاگ جنسی مقاصد کے لئے استعمال، یہ سب لامحدود مسرت وخوشی کے ذرائع ہیں، لیکن ساری سائنسی وٹیکنالوجی ترقی اور آسائش کے مادی سامان کے باوجود لامحدود مسرت تو کجا، جدید انسان کی زندگی سے بیزاری ومایوسی کو روکنا ہی دشوار ہوگیا ہے، اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ مغربی فکر اور مغربی تہذیب نے خدا، مذہب اور وحی سے آزاد ہو کر انسان کی شخصیت اور لامحدود مسرت کے اصل مقام کو سمجھنے میں ہولناک غلطی کی ہے، جس کی سزا پوری انسانیت بھگت رہی ہے کہ ذہنی اور نفسیاتی بیماریاں بڑھ رہی ہیں، خودکشی کے تناسب میں اضافہ ہورہا ہے، انسان بیزاری کی روش عام ہوگئی ہے، مادے کی پرستش میں اضافہ ہوگیا ہے وسائل کی چھینا جھپٹی کے لئے تصادم کی روش عام ہوگئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لامحدود مسرت کا اصل مقام تو جنت ہے، یا لامحدود مسرت کے قریب کی حالت انسان کی خودشعوری یعنی روح کی، روح مطلق ہستی کی عبادت اور ذکر وفکر کے ذریعہ اس ہستی کے قرب کا مقام ہے، یہ مقام نفسی قوتوں کی پامالی، اوصاف حمیدہ اور عبادت کی گہرائیوں سے ہی کسی حد تک حاصل ہوسکتا ہے، اس کی دوسری کوئی صورت موجود نہیں، جدید مادی انسان جس کے دل کی صلاحیتوں کو نفسی قوتوں نے مضمحل کردیا ہے، اسے یہ نکتہ سمجھانا غیر معمولی طور پر دشوار ہوگیا ہے۔

(۳۹) اہل اللہ اور صوفی شعراء کے ہاں عشق کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے، عشق سے زندگی میں جوتحرک ومعنویت پیدا ہوتی ہے، وہ کسی دوسرے طریقہ سے ممکن نہیں۔ عشق، انسانی شخصیت کو محبوب حقیقی کے مقاصد کے لئے ساری توانائیوں کے استعمال اور فنائیت اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

اقبال کا ایک شعر ہے۔

علم ہے ابن الکتاب
عشق ہے ام الکتاب

ساری زندگی علوم وفنون میں خرچ کرنے کے باوجود یہ علم ایک معمولی کتاب سے زیادہ حاصل نہیں ہوتا، جوں جوں فرد علوم میں آگے بڑھتا ہے، عام طور پر اسی حساب سے وہ حجابات میں مبتلا ہوتا ہے اور سلیقہ انسانیت سے دوری ہوتی ہے، لیکن ایسا علم جس میں عشق کی کارفرمائی موجود ہو، اس سے شعور اتنا منور ہوتا ہے کہ وہ بے شمار کتابوں کا موجد بن جاتا ہے، عشق کے بغیر زندگی سراسر حسرت ہے، عشق، فرد کو محبوب کی مخلصانہ اطاعت وعبادت کے لئے مضطرب کردیتا ہے، عشق، نفسی قوتوں کی پامالی اور انسانی اوصاف کی بہرہ وری میں اہم کردار ادا کرتا ہے، جہاں عشق کے اجزاء آتے ہیں، وہاں سلیقہ انسانیت اور آداب انسانیت ازخود آجاتے ہیں، عشق، نفسی قوتوں کو آتش عشق میں جلاکر اسے مہذب بنانے کا ذریعہ ہے۔

عشق کی یہی وہ اہمیت ہے، جس کی بنا پر علمائے ربانیین نے ہر دور میں افراد کی تربیت وتہذیب وتزکیہ کے لئے انہیں راہ عشق میں چلاکر، انہیں معاشرے کے لئے کارآمد بنایا ہے اور سعادت دارین سے ہمکنار کیا ہے۔

آج کا دور اس اعتبار سے سب سے زیادہ سیاہ ترین دور ہے کہ اللہ محبوب سے عشق کی بات سننے کے لئے لوگوں میں سرے سے کوئی آمادگی ہی موجود نہیں، حالت یہ ہے کہ لوگ مادیت پرستی کی جلائی ہوئی آگ میں چلنا پسند کریں گے، ہر طرح کے ذہنی نفساتی عذابوں سے دوچار ہونا برداشت کریں گے، اپنے اشتعال اور غیض وغضب سے خاندان اور گھروں کے ماحول کو فساد میں تبدیل کردیں گے، موت سے پہلے ہر وقت موت کے سے حالات سے دوچار ہونا قبول کرلیں گے، لیکن عشق کے ذریعہ محبوب حقیقی کے سایہ رحمت میں داخل ہونے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔

اللہ محبوب کی اس بے قدری پر خون کے جتنے بھی آنسو بہائے جائیں، کم ہیں۔

(۴۰) حدیث شریف ہے کہ جو شخص اپنے علم پر عمل کرتا ہے، اسے نیا علم عطا کیا جاتا ہے اور جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا، وہ حیران اور سرگرداں رہتا ہے۔

علم دراصل عمل ہی کے لئے ہوتا ہے، علم پر عمل کے بغیر علم کی خصوصیات اور اس کی تاثیری صلاحیتیں ظاہر نہیں ہوتی، قرآن میں فرمایا گیا ہے **انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء** بے شک اللہ کے بندوں میں اللہ سے ڈرنے والے علماء ہی ہیں۔

اس آیت میں علم کی سب سے بڑی خاصیت ہی یہ بتائی گئی ہے کہ اس سے خشیت پیدا ہوتی ہے، اس آیت کی تشریح میں بعض مفسروں نے لکھا ہے کہ یہاں ایسے اہل علم کی نفی کی گئی ہے، جن میں خشیت موجود نہ ہو۔

(۴۱) ہمارے ملک کے معاشی، سیاسی، ریاستی اور اجتماعی نظام میں بحران کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اللہ سے عہد کرکے نفاذ اسلام کے لئے جو ملک حاصل کیا گیا تھا، ہمارے حکمرانوں اور ملک کے مؤثر طبقات نے اللہ سے اس عہد کی خلاف ورزی کی اور اہل مغرب کی تقلید اختیار کرکے،ملک کے پورے اجتماعی نظام کو سیکولر بنیادوں پر چلانے کی کوشش کی، نظام تعلیم سے دین کی بنیادی تعلیمات کو فراموش کیا، مخلوط تعلیمی نظام کو جاری کیا، نظام تعلیم میں فرنگی زبان اور فرنگی تہذیب پر زور دیا گیا، معیشت سے سود کے خاتمہ کی ساری کوششوں کو ناکام بنایا، عدلیہ کو مغربی قانون کے تحت چلانے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے ہمارے جج اور وکلام حضرات اسلامی شریعت اور اسلامی قوانین سے سرے سے ناآشنا رہے، ہمارے حکمرانوں اور نوکر شاہی نے ملک میں ایسی لوٹ مار مچائی کہ عالمی اداروں سے اربوں ڈالر کا قرضہ لے کر، قرضہ کی بڑی رقم مختلف طریقوں سے ہضم کرنے کی کاوش کی۔

یہ اللہ سے کئے گئے عہد کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے کہ اللہ نے ہمیں ہمارے نفسوں اور مادہ پرست عالمی قوتوں کے حوالے کردیا۔

اب بھی وقت ہے کہ ہم سنبھلیں اور اللہ سے کئے گئے عہد کو پورا کریں اور ملک کے سارے نظام کو رفتہ رفتہ اسلامی خطوط پر تشکیل دینے کی خلوص دل سے کوشش کریں، ایسا کرنے سے ہی ہمارا بحران دور ہوگا، ہم اللہ کی مدد کے مستحق ہوں گے۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بہت پہلے فرمایا تھا:

’’ پاکستان جس مقصد کی خاطر قائم کیا گیا، جو اصل بنیاد ہے، اس پر اس کے معاشرے اور اس کی اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ اور ہرگوشہ کی تعمیر نو کی جائے، یہاں کی معاشرتی زندگی، یہاں کی ثقافت، حتیٰ کہ رسوم ورواج کو اسلام کی تعلیمات اور قرآن وسنت کی واضح ہدایت میں ڈھال دیجئے، یہ کام آپ کرلیں گے تو یقین دلاتا ہوں کہ اللہ آپ کی خصوصی حفاظت فرمائے گا، غیب سے مدد آئے گی، **ان تنصرالله ينصركم** (سورۃ محمد آیت ۷)

(اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ یقیناً تمہاری مدد کرے گا) یہاں اللہ کی مدد کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی کامل اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے، صرف زندگی کے ایک گوشے میں نہیں، بلکہ حیات انفرادی اور اجتماعی کے ہر گوشے اور شعبے میں۔

اگر آپ یہ کام کرلیتے ہیں تو میں یقین دلاتا ہوں ’’تاریخ دعوت وعزیمت‘‘ کے مصنف اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو عالم اسلام کے علاوہ پوری دنیا میں گھوما پھرا ہے، وہاں کے علمی مراکز میں گیا ہے۔ اصحاب فکر ونظر سے ملا ہے کہ اسلام پر پورے اخلاص کے ساتھ عمل کرنے کے نتیجے میں آپ کو کہیں سے مدد لینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، اللہ تعالیٰ براہ راست آپ کی مدد اور نصرت وحمایت کرے گا، کیا اس سے بڑھ کر بھی کسی نعمت کا تصور کیا جا سکتا ہے۔‘‘

(۴۲) اہل علم اور بڑے منصب پر فائز افراد کا مزاج عام طور پر علمی برتری، احساس برتری اور تحکمانہ انداز کا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے لئے بھی مسائل پیدا کرتے ہیں تو معاشرے کو بھی فساد سے دوچار کردیتے ہیں، زیادہ علم اور عہدوں میں نشہ کی سی کیفیت ہوتی ہے، نشہ کا خمار فرد وافراد کو آپے سے باہر کر دیتا ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ فرد فیصلہ کرلے کہ کسی نہ کسی فرد کو بڑا بناکر، اس کی سرپرستی میں آجائے اور یہ سمجھکر اس طرح کے فرد کی صحبت اختیار کرے کہ یہاں میرا علم، میری ذہانت، میرا منصب اور میری حیثیت سب ختم ہے، ایسا کرنے سے نفسیات میں موجود پچاس فیصد سے زیادہ فساد کی اصلاح ہوجائے گی اور علمی برتری اور تحکمانہ روش میں بڑی حد تک کمی واقع ہوجائے گی، اگر اس طرح کا فرد کسی اہل اللہ کے سامنے خود سپردگی اختیار کرے تو اس کی اصلاح کے عمل میں تیزی آتی جائے گی، اس طرح علم، منصب، ذہانت، اقتدار اور سیاست میں جو فساد برپا ہے، معاشرہ اس سے بڑی حد تک محفوظ ہوجائے گا، بلکہ اس سے معاشرہ علمی برتری، اور تحکمانہ روش کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بحران سے بچ جائے گا، اگر مذکورہ طبقات چاہتے ہیں کہ لوگوں کی دل آزاری، افراد سے تصادم اور کھینچا تانی سے بچا جائے تو اس عمل سے انشاء اللہ ان کی ذات افراد معاشرہ کے لئے باعث خیر وبرکت ثابت ہونا شروع ہوگی۔

(۴۳) اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ بعض ایسے فتنے ظاہر ہوں گے کہ فرد ان

فتنوں کو دیکھنے کے لئے جائے گا کہ آخر دیکھیں تو سہی کہ کیا ہے، جانے کے بعد وہ خود اس فتنے میں مبتلا ہوجائے گا۔

اس دور میں ہم آئے دن اس کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، ہم ٹیلی ویژن اور فیس بک وغیرہ کھولتے ہیں کہ دیکھیں کہ کیا ہورہا ہے، دیکھنے کے بعد واہیات پروگرام یا عورتوں اور مردوں کے رقص میں ہم اتنا محو ہوجاتے ہیں کہ آنکھیں ان منظروں سے ہٹنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتی۔

اسی طرح ہم اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے اعلیٰ جدید تعلیمی اداروں میں داخل کراتے ہیں، وہاں جاکر لڑکے اور لڑکیاں دوستی کے رشتے میں منسلک ہوجاتی ہیں، پھر شرم وحیا سے عاری واقعات ہوتے ہیں۔

یادوافراد آپس میں لڑ رہے ہوتے ہیں، ہم انہیں چھڑانے کی نیت سے جاتے ہیں، لیکن جانے کے بعد خود اس لڑائی کا حصہ بن جاتے ہیں یا ہم مسلکی جھگڑوں کے پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں، تقاریر سن کر، ہم دوسرے مسلک والوں کے خلاف جذباتِ نفرت سے بھر جاتے ہیں، اگر ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے تو ان سے بھڑ جاتے ہیں۔

اس دور میں فتنوں کی بھرمار ہے، عدم احتیاط کا معمولی مظاہرہ ہوتا ہے تو اس کے نتیجہ میں ہم ان فتنوں کا شکار ہوجاتے ہیں اور دینی اعتبار سے ہماری حالت میں پستی آنے لگتی ہے، سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔

(۴۴) موجودہ دور کو اگر فتنوں کے غلبہ کا دور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، جدیدیت کا فتنہ، عورت ومرد کی آزادی ومساوات کا فتنہ، اسلام میں جدیدیت کی آمیزش کا فتنہ، سلف صالحین اور بزرگان دین پر اعتماد کے خاتمہ کا فتنہ، اشتعال اور غیظ وغضب کا فتنہ، دین ومذہب اور سیاست کے نام پر نئی نئی جماعتوں کا فتنہ، الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ مادی حسن کی نمائش کا فتنہ، غرض کہ فتنوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔

ان سارے فتنوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ فرد صالح اور متقی افراد کے ساتھ دوستی کے ماحول میں رہے اور ان سے اپنے تعلق کو مستحکم کرتا ہے۔

(۴۵) اس دور کا ایک بڑا فتنہ اپنے آپ سے حسن ظن اور دوسروں سے بدگمانی کا فتنہ ہے، جس نے افراد کے دلوں کو ایک دوسرے سے توڑ کر رکھدیا ہے اس فتنہ کی گہرائی میں جاکر جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کی جڑ میں احساس برتری کا جذبہ ہی کارفرما ہے، فرد کا نفس چاہتا ہے کہ زندگی کے ہر معاملہ میں اس کی شخصیت نمایاں رہے، دوست واحباب کی طرف سے اس سے امتیازی سلوک کیا جاتا رہے، اسے داد ملتی رہے جب اسے یہ حیثیت نہیں ملتی اور دوسروں کو تکریم ملتی ہے تو اس سے اس کی انا مجروح ہوتی ہے اور وہ دوسروں کے خلاف بدگمانی کے مرض میں مبتلا ہوجاتا ہے، اور یہ بدگمانی اسے دوسروں کی تحقیر وتردید کی روش پر آمادہ کرتی ہے اس طرح بدگمانی کے مرض سے معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے۔

ضرورت ہے کہ خوداحتسابی سے کام لے کر اپنی شخصیت میں موجود اپنی برتری کے بتوں کو توڑنے کی سنجیدگی سے کوشش ہو، ورنہ شخصیت زندگی بھر سلیقۂ انسانیت کے بحران سے دوچار رہے گی اور فرد کی حالت یہ ہوگی کہ اسے دوسرے افراد تو عیبوں سے بھرے ہوئے نظر آئیں گے، جب کہ وہ اپنی شخصیت کو پاک پوتر سمجھتا رہے گا۔

(۴۶) دنیا میں اس وقت کفر اور اسلام کے درمیان جو معرکہ برپا ہے، اس میں غیر جانبدار رہنا بالکل غلط ہے، بلکہ حمیت دین کے منافی ہے، لیکن اس سے مقابلہ کی بہتر صورت یہی ہے کہ مسلم معاشرے کو اسلامی اعتبار سے مستحکم کیا جائے، تاکہ افرادِ معاشرہ تہذیب جدید کی تقلید سے باہر نکل آئیں، باطل کو اہل اسلام پر جو کامیابی حاصل ہورہی ہے، اس کا بنیادی سبب ایمان کی کمزوری، باطل تہذیب سے دلبستگی اور مادی مناظر سے لذتیاب ہونے کی نفسیات ہے۔

(۴۷) اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ مسلم معاشرے کی تربیت کا مؤثر نظام متشکل ہو، یہ کام دین کا درد رکھنے والے جدید صلاحیتوں کے حامل افراد سرانجام دے سکتے ہیں، اس لئے کہ باطل، مادی افکار اور مادی تہذیب کی صورت میں سامنے آیا ہے، اس سے ہمیں جو مقابلہ درپیش ہے، وہ ہمہ گیرو ہمہ جہتی نوعیت کا ہے، یہ مقابلہ فکری محاذ پر بھی ہے تو معاشرتی اور تعلیمی محاذ پر بھی، یہ مقابلہ باطل کا شعور رکھنے والے دردمندانہ افراد ہی کرسکتے ہیں، لیکن اس کے لئے علمی صلاحیتوں کے ساتھ روحانی، باطنی اور وجدانی صلاحیتوں کی بھی ضرورت ہے، جو اہل اللہ کی صحبت کے بغیر حاصل ہونا مشکل ہیں۔

(۴۸) کم ملنا اور کم بولنا، یہ دو اہم اصول ہیں کہ اگر طالب ذکر کے ساتھ ان کو اختیار کرے گا تو اس کی اصلاح میں تیز رفتاری آتی جائے گی، ان دو اصولوں کے بارے میں عدم احتیاط کی روش فرد کو معصیت میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بنتی ہے اور اس کی اصلاح کے عمل کو متاثر کرتی رہتی ہے۔ چونکہ مبتدی طالب کو زبان پر قابو نہیں ہوتا، اس لئے وہ نفس کی اکساہٹ پر زیادہ بولنے کا حریص ہوتا ہے۔

زیادہ ملنے سے پرہیز بھی اس لئے ضروری ہے کہ مبتدی طالب کا قلب چونکہ ذکر کے وافر ذخیرہ سے خالی ہوتا ہے، اس لئے زیادہ ملنے سے ایک تو وہ لوگوں کی منفی شعائیں اخذ کرتا ہے، جس سے تھوڑے بہت ذکر کا اثر مدھم ہوجاتا ہے، دوم یہ کہ ملنے سے غیرضروری اور خود نمائی پر مشتمل گفتگو سے بچنا از حد دشوار ہے۔

(۴۹) اس دور میں نگاہ کی حفاظت کا مسئلہ سب سے زیادہ دشوار ہوگیا ہے، موبائل پر نیٹ آنے کی وجہ سے پوری دنیا کا مادی حسن اور اس کے مناظر موبائل میں آگئے ہیں، عورت کی آزادی کا دور تو ویسے ہی شروع ہوگیا ہے، ان حالات میں نگاہ کی حفاظت کے لئے خصوصی اہتمام ہونا ضروری ہے، دوسری صورت میں تھوڑی بہت جو دینداری قائم ہے، وہ بھی خطرے سے دوچار ہے، اس لئے کہ ایک گناہ سے دوسرا گناہ اور دوسرے گناہ سے تیسرا گناہ سرزد ہوتا ہے اور گناہوں سے نیکی کی استعداد سلب ہونے لگتی ہے۔

(۵۰) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا بیان کردہ یہ نکتہ بڑا اہم ہے کہ جسے بزرگ بننا ہو، وہ کسی دوسرے کے پاس جائے، جسے انسان بننا ہو، وہ میرے پاس آئے۔

انسان بننا یعنی سلیقہ انسانیت سے آراستہ ہونا، سب سے دشوار گزار کام ہے اور غیرمعمولی مجاہدوں کا متقاضی، جب تک ذکر وفکر کے مجاہدوں سے نفسی قوتیں پامال نہیں ہوتی، تب تک سلیقۂ انسانیت سے بہرہ وری نہیں ہوتی، اس مقصد کے لئے جسمانی مجاہدوں اور مشقتوں سے بھی کام لیا جاتا ہے، مثلاً جسے زیادہ بولنے کا مرض ہے، اس کے بولنے پر پابندی عائد کرنا، جو حب مال کا مریض ہے، اسے اللہ کے لئے مال خرچ کرنے کی تاکید کرنا، جو حب جاہ کا مریض ہے، اسے دوسروں کی خدمت کے کام پر لگانا وغیرہ۔

روحانی اور جسمانی مجاہدے مل کر سلیقۂ انسانیت پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس دور میں چونکہ افراد میں اصلاح کی حقیقی طلب کا شدید فقدان ہے، اس لئے جسمانی مجاہدے لگ بھگ موقوف ہوگئے ہیں۔

(۵۱) نفس کو مہذب بنانے اور اسے سلیقہ انسانیت سے آراستہ کرنے کا کام ایسا ہے، جس سے آخرت کی دائمی زندگی کی نجات وابستہ ہے، اس لئے اس کے لئے جتنے بھی مجاہدے ہوں، کم ہیں، نفس چونکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی راہ میں سخت مزاحم ہے، اس لئے اسے مجاہدوں کی راہ پر گامزن کرکے نیکی کے اس کے ملکہ کو مستحکم کرنا ہے، جسے مجاہدوں کی سعادت حاصل ہو، وہ خوش نصیب ترین فرد ہے۔

(۵۲) اس دنیا میں ہماری حالت یہ ہے کہ ہم سوئے ہوئے ہیں، موت کے بعد بیدار ہوں گے، جب دوسری دنیا کے حقائق آشکار ہوں گے، لیکن اس وقت کا بیدار ہونا کسی کا کام نہیں ہوگا۔

(۵۳) اس وقت انسانیت کو علوم وفنون سے زیادہ روشن ضمیر انسانوں کی ضرورت ہے، جو انہیں زندگی کی معنویت اور حقیقت سے آشنا کرسکیں اور انہیں زندگی کی لطافت وحلاوت سے بہرہ ور کرسکیں، مادیت کی ہماہمی اور علوم وفنون کی موجودہ دنیا میں بظاہر تو زندگی میں رونق پیدا ہوئی ہے اور آسائش کا مادی سامان بھی وافر مقدار میں حاصل ہوا ہے، لیکن اس سے باطن کی دنیا ویران سے ویران تر ہوگئی ہے اور روحانی سکون کی نعمت عظمیٰ سلب ہوگئی ہے۔

روشن ضمیر انسان جو باطنی طور پر ہر وقت آباد، شاداب اور مسرت وحلاوت سے سرشار رہتے ہیں، جو انسانیت کو خدا پرستی پر مبنی روحانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلا کر ان کے باطن کو ہر قسم کے خوف وحزن، یاسیت اور مادیت پرستی کے سارے اثرات سے نجات دلانا چاہتے ہیں، اس طرح کے افراد ہی انسانیت کے لئے چراغ راہ ہیں، ان کی صحبت ومعیت سے ہی طاقتور مثبت شعائیں منتقل ہوکر، زندگی میں معنویت پیدا کرنے، اسے حقیقی رخ دینے اور پاکیزہ بنیادوں پر بدلنے میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

آج انسانیت، خوف وحزن، یاسیت اور زندگی کے جس ہمہ جہتی بحران سے دوچار ہوئی

ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ دنیا مادہ پرست اورنفس پرست انسانوں سے بھرگئی ہے، ان کے جرائم، ان کی شرارتوں، ان کی پھیلائی گئی کدورتوں اورظلمات سے انسانیت کے لئے یہ زندگی ہلاکت خیز بن گئی ہے۔

اس ساری صورتحال سے بچاؤ کی صورت یہی ہے کہ طاقتور روحانی صلاحیتوں کے حامل روشن ضمیر انسانوں کو تلاش کرکے انہیں اپنی اجتماعی زندگی کا حصہ بنائیں اور زندگی کے ہر موڑ پر ان کی صحبت ومعیت اختیار کرکے، باطن کو منور وآباد کرنے اور نفسانیت وشیطنت کی قوتوں کے خلاف صف آرائی کے لئے ان کی ملکوتی قوتوں سے استفادہ کریں۔

انسانیت نے لگ بھگ پچھلے تین سو سال سے مادیت پر مشتمل سرمایہ داری کا جو سفر طے کیا ہے، اس نے اسے انتہائی قابل رحم حالت تک پہنچایا ہے، اس کے لطیف اور پاکیزہ انسانی جذبات کو کچل دیا ہے، اس سے رحم وشفقت کے احساسات کوختم کر دیا ہے، اسے حیوانیت کی بدترین صورت تک پہنچایا ہے، اس نے خودکشی کی وبا کو عام کر دیا ہے، اب قافلہ انسانیت کی عالمی قیادت کو انسانیت کی حالت زار پر رحم کرنا چاہئے اور اسے پاکیزہ انسانی احساسات وجذبات سے بہرہ ور کرنے کی راہ میں حائل رکاوٹوں کوختم کرنا چاہئے اور مادیت پرستی کی روح کو پھونکنے کی روش سے باز آنا چاہئے اور انسانیت کو ایسے سازگار مواقع فراہم کرنے چاہئے، جس سے ان کے لئے روشن ضمیر انسانوں تک رسائی آسان ہوجائے، تاکہ وہ ان سے خداپرستی پرمبنی روحانیت سے بھرپور استفادہ کرکے انسانیت کے قافلہ کو پاکیزہ اورصحتمند رخ دے سکیں۔

ہم یہ انتباہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اب انسانیت مادہ پرستی پرمبنی نظام کی مزید تباہیوں کی متحمل ہرگز نہیں، اب وہ روحانی، اخلاقی، نفسیاتی اور وجدانی طور پر نڈھال ہوگئی ہے، اب اس میں مادہ پرستی پرمبنی مزید تجربات کی سکت باقی نہیں رہی ہے، اس لئے اب انسانیت پر رحم کھاتے ہوئے اسے اس کے پاکیزہ فطری جذبات کے نشوونما کی راہ میں ساری رکاوٹیں ختم کی جائیں اور روشن ضمیر انسانوں کو یہ موقعہ دیا جائے کہ وہ قافلہ انسانیت کے زخموں پر مرہم لگا سکیں اور اس کی پاکیزہ روحانی بنیادوں پر تربیت میں کردار ادا کرسکیں۔

روشن ضمیر انسانوں کی علامتوں اورخصوصیات میں جو چیزیں شامل ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

- سیرت وکردار میں پاکیزگی، محبت ورواداری، فراغ دلی ووسعت قلبی کی صلاحیت۔
- دنیا واہل دنیا سے بے نیازی، وبے رغبتی۔
- سادہ زندگی کے مظاہر اور سادہ طرز زندگی کے احیاء کی کاوشیں۔
- نام ونمود وشہرت سے ہرممکن حد تک بچنے کی سعی۔
- اپنے عمل کے ذریعہ اپنی شخصیت کی نفی وعاجزی کا مظاہرہ ۔
- اللہ کے بندوں کی دنیا وآخرت کی بھلائی کے سلسلہ میں حریصانہ ادائیں۔
- اپنے معتقدوں کی کوشش اور خواہش کے باوجود فقر محمدی سے دستبردار نہ ہونے کی ادائیں۔
- اپنی عمل سے اپنی بزرگی اور اپنے مقتدانہ ہونے کا اظہار۔
- زندگی کے ہر معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں پیش قدمی وچشتی کا مظاہرہ۔
- قیل وقال سے زیادہ عمل کے خصوصی اہتمام کی کاوشیں وغیرہ۔

حقیقی روشن ضمیر جو تزکیہ وتقویٰ کا ثمرہ ہوتی ہے، وہ مجاہدوں کی بھٹی سے گزرے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

دوسری صورت میں روشن ضمیری یا بزرگی کے نام پر شان ومان کی حریصانہ زندگی گزارنے کی ادائیں ہی غالب ہوں گی، اس طرح کے لوگوں سے تعلق کے نتیجہ میں کچھ کیفیات تو حاصل ہوسکتی ہیں۔لیکن دنیا سے استغنا وبے نیازی اور اخلاق حسنہ کی دولت عظمیٰ حاصل نہیں ہوسکتی۔

(۵۴) سلیقہ انسانیت سے بہرہ وری کے لئے عاشق کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ خودی میں ڈوبنے کے عمل کو جاری رکھتا ہے، مسلسل اس عمل سے وہ خودی کے تجزیہ وتحلیل کے ذریعہ اس کی خصوصیات معلوم کرتا ہے، جس طرح سائنسدان لیبارٹری میں اشیاء کے تجزیہ وتحلیل سے ان اشیاء کی خصوصیات معلوم کرتا ہے۔ اسی طرح عاشق اپنے اندر میں ڈوبنے کے ذریعہ خودی یعنی اصل انسانی شخصیت کی ساری خصوصیات تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، وہ یہ

دیکھکر حیرت زدہ ہوجاتا ہے کہ خودی (انسان کی اصل شخصیت) محبوب حقیقی (خالق کائنات) سے عشق ومحبت کے ایسے رشتہ میں منسلک ہے کہ اسے محبوب سے کسی بھی طور پر جدا نہیں کیا جا سکتا، محبوب حقیقی سے تھوڑے عرصہ کی جدائی بھی اس کے لئے ناقابل برداشت اذیت کا باعث بنتی ہے، خودی (انسان کی اصل شخصیت) محبوب کے انوارحسن سے آخری حد تک متمتع ہونا چاہتی ہے، اس کا یہ نصب العین اسے اتنا عزیز ہوتا ہے کہ وہ جسم وجان کی ساری توانائیاں خرچ کرکے بھی محبوب حقیقی کے قرب کے مقام پر فائز ہونا چاہتی ہے۔

خودی (انسان کی اصل شخصیت) کی آرزو ہوتی ہے کہ اسے دوسری دنیا میں محبوب کا براہ راست مشاہدہ حاصل ہو، تاکہ وہ لازوال مسرت اور لامحدود خوشیوں سے ہمہ آہنگ ہوسکے۔

خودی جب تک دنیا میں محبوب کے قرب کے امکانی حد تک مقام تک نہیں پہنچتی، تب تک اس کا اضطراب، کرب اور محبوب سے وصال کا سفر جاری رہتا ہے۔

خودی محبوب حقیقی کے اخلاق سے بہرہ ور ہونا چاہتی ہے۔ **(تخلقوا بااخلاق الله)** محبوب کے ان اخلاق سے بڑی حد تک بہرہ وری کی صورت ایک ہی ہے، وہ یہ ہے کہ خودی، مادی اورنفسی حجابات سے آزاد (بلند ہوکر) فنا سے بقا کے مقام پر فائز ہوجائے، یہ مقام ایسا ہے جہاں خودی کو نفس اورنفسی قوتوں سے طویل عرصہ تک معرکہ آرائی کرکے، ان قوتوں سے بڑی حد تک جان خلاصی حاصل کرنی پڑتی ہے۔

جس طرح خودی کی اپنی خصوصیات ہیں کہ وہ محبوب کے لئے بے چین رہتی ہے، یہ بے چینی اسے مسلسل محبوب کے لئے مصروف عمل رکھتی ہے، اسی طرح مادی چیزوں کے استعمال سے وجود میں آنے والے نفس کی بھی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ نفس کی یہ خصوصیات خودی میں ڈوبنے اور مسلسل ڈوبتے رہنے کے نتیجہ میں ہی سامنے آتی ہیں، نفس قدم قدم پر خودی کی راہ میں حائل ہوکر، محبوب سے اس کے رشتے کو توڑکر مادیت اور مادی حسن سے اس کے رشتہ کو مستحکم کرنا چاہتا ہے، لیکن جو خودی ایک بارمحبوب کے انوارحسن کی جھلک کا مشاہدہ کر چکی ہوتی ہے، وہ نفس کی ساری رکاوٹوں ومزاحمتوں کا مقابلہ کرکے بھی محبوب کے حسن سے ہرصورت میں فیضیاب ہونا چاہتی ہے۔ چنانچہ عاشق خودی کے زور دار داعیے کے تحت نفس کی طرف سے ہونے والی ساری مزاحمت اور مخالفت کا پورے حوصلہ سے مقابلہ کرتا ہے، اس مقابلہ میں وہ کبھی مادی قوتوں کے سامنے ڈھیر ہوجاتا ہے اور گرجاتا ہے، لیکن محبوب کی محبت اسے اٹھا کر دوبارہ مجاہدوں پر گامزن کرتی ہے، یہ ایک مسلسل عمل ہوتا ہے، جس میں عاشق کو خودی اور نفسی قوتوں کے درمیان تصادم وٹکراء کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

خودی جب مادی قوتوں پر فتحیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہے تو محبوب کے لئے اس کی راہ میں حائل بیشتر رکاوٹیں دور ہوجاتی ہیں، اس طرح خودی کے لئے راستہ صاف ہوجاتا ہے اور نفس کی حالت میں تبدیلی ہوکر وہ نفس مطمئنہ ہوجاتا ہے۔

خودی اور نفس کے درمیان یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ دونوں کے تقاضے ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ خودی، محبوب کے انوارحسن کے مشاہدہ سے کم پر راضی ہونے کے لئے تیار نہیں، اس کے بغیر خودی بے پناہ اضطراب کے حالات سے دوچار ہونے لگتی ہے، خودی کی غذا ہی ذکر وفکر اور عبادت کی گہرائی کے ذریعہ محبوب کا مشاہدہ ہے، جب خودی کی یہ ضرورت پوری نہیں ہوتی تو وہ قیامت خیز حالات سے دوچار ہونے لگتی ہے، ڈپریشن، اشتعال، چڑچڑاپن، زندگی سے بیزاری، مادی حسن پر فدائیت کی ادائیں، انسان آزاری کی روش اور اعمال بد وغیرہ یہ ساری چیزیں خودی کو اس کی غذا نہ دینے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں، جب کہ نفس فرد کی شخصیت کو مادی حسن اور دنیا پر ٹوٹ پڑنے پر اکساتا وابھارتا رہتا ہے۔

نفس کی خصوصیات میں یہ بات شامل ہے کہ خودی کی معیت کے بغیر اسے سکون وطمانیت ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا، خودی کی معیت اسے خودی کے تقاضوں کی تکمیل کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتی ہے۔

نفس، خودی کے جذبات محبت کے تقاضوں کے بغیر جہنم کا ایندھن ہی ہے، اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں، خود اس دنیا میں نفس کو مادی دنیا میں استغراق کی وجہ سے ایسے ایسے حادثات سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر اسے موت کے سے حالات سے سابقہ درپیش ہوتا ہے۔

خودی نے الست بربکم کی صدا سنی ہوئی ہے، اس کے جواب میں اس نے قالو بلیٰ کہا ہے، خودی کی گہرائیوں میں قالو بلیٰ کی صدا اب بھی گونج رہی ہے، اس صدا ہی کا نتیجہ ہے کہ

عاشق جب محبوب کی اس راہ پر گامزن ہوتا ہے تو اسے قرآن کی درج ذیل آیتوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ **ونحن اقرب الیہ من حبل الورید** (اور ہم تم سے تمہاری رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں) **وفی انفسکم افلا تبصرون** (اور ہماری نشانیاں تمہارے اندر موجود ہیں، آخر تم دیکھتے کیوں نہیں ہو) **وھو معکم اینما کنتم** (اور تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے)۔

محبوب کی معیت کا احساس وہ چیز ہے، جو عاشق کی دنیاوی زندگی کو جنت کا منظر بنا دیتا ہے۔

یہ بات دو اور دوچار کی طرح واضح ہے کہ سلیقۂ انسانیت سے بہرہ وری کی سعادت (جس سے انسانیت کی زندگی وبقا وابستہ ہے) وہ خودی (یعنی اصل انسانی شخصیت) کے جذبات محبت کی تکمیل کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

نہایت بدقسمتی بلکہ سخت محرومی اور تشویش کی بات ہے کہ یہی وہ سب سے اہم بات ہے، جو جدید انسان سننا نہیں چاہتا، اس بات کے سمجھنے اور سننے سے اس نے عقل اور کانوں پر پردے ڈال دیئے ہیں۔

ملعون ہے وہ مادی تہذیب اور اس کے علوم وفنون، جس نے انسانیت کو اس مقام پر لاکھڑا کیا ہے کہ وہ فطرت کی آواز اور روح کی صدا سننے کے لئے تیار نہیں، اس طرح اس نے اپنے لئے اس دنیا کو ایک طرح سے جہنم کا منظر بنا دیا ہے۔

(۵۵) فرد کو معاشرے میں ہر وقت کسی نہ کسی دعوت سے سابقہ ضرور درپیش ہوتا ہے، یہ دعوتیں ایسی ہوتی ہیں، جو فرد کو اپنی طرف کھینچنے لگتی ہیں، مادیت پرستی کی دعوت، قومیت پرستی کی دعوت، مادی حسن پر فدائیت کی دعوت، ماڈرن ازم کی دعوت، عقلیت محض کی دعوت، عقلی نوعیت کی تحریکوں میں شرکت کی دعوت، جماعتوں اور گروہوں کو کلی حق سمجھکر ان میں شرکت کی دعوت، اب تو موبائل ٹیکنالوجی کے ذریعہ مادی حسن میں مستغرق ہونے کی دعوت عام ہے، جس نے نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد کے ذہنوں کو مسموم کر دیا ہے۔

یہ ساری دعوتیں ایسی ہیں، جن میں خیر کے پہلو نہ ہونے کے برابر ہیں، لیکن یہ دعوتیں ایسی مؤثر ہیں کہ افراد ان میں زبردست کشش محسوس کرکے اپنا دل انہیں دینے پر مجبور ہوتے ہیں، سب سے بڑی دعوت تو نفس کی طرف سے ہوتی ہے، جو خواہشات کی پرستش کی صورت میں ہوتی ہے، جس سے بچنا بہت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

ان ساری دعوتوں سے بچنے کی واحد صورت ایک ہی ہے، وہ ہے راہ محبت میں داخل ہوکر عقیدہ توحید کو راسخ کرنے کی صورت۔ اللہ کی محبت ایسی چیز ہے جو فرد میں اللہ کے لئے والہانہ پن پیدا کردیتی ہے، ان کے سارے جذبات حسن کے تسکین کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے، جب سارے جذبات حسن کی تسکین ہوگی تو ساری دعوتیں غیر مؤثر ثابت ہوں گی اور فرد کسی بھی دعوت سے متاثر ہوئے بغیر محبت کی راہ پر تیز رفتاری سے گامزن رہے گا، البتہ حقیقی محبوب سے عدم محبت کی وجہ سے باطن میں زبردست خلا موجود رہے گا، یہ خلا فرد کو زندگی بھر حالت تذبذب میں رکھکر مختلف قسم کی دعوتوں کی طرف متوجہ کرنے پر مجبور کرتا رہے گا۔

اللہ سے والہانہ محبت کی راہ ہی دین اسلام کی راہ ہے، صراط مستقیم ہے اور انعمت علیھم (انعام یافتہ لوگوں کی) راہ ہے، پاکیزہ محبت فرد وافراد کو مادیت پرستی اور نفس پرستی کی ہر صورت سے بلند کرنے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

ہم نے مختلف دعوتوں سے متاثر افراد کو دیکھا ہے کہ وہ زندگی کے کسی موڑ پر ان دعوتوں سے متاثر ہوکر، ان دعوتی گروہوں میں شامل ہوئے تو وہ زندگی بھر ان دعوتوں کے اثرات سے باہر نہ نکل سکے، حالانکہ وہ شدید ذہنی وقلبی اضطراب کا بھی شکار رہے، لیکن ان کے لئے ان دعوتوں کے منفی فکری اثرات اور ان کے حصار سے نکلنے کی صورت پیدا نہ ہوسکی، اس لئے ضرورت ہے کہ طاقتور منفی دعوتوں کے موجودہ ہمہ گیر ماحول میں فرد بلاتا خیر اللہ کی راہ محبت میں داخل ہوکر عقیدہ توحید میں محصور ہو، عقیدہ توحید کا استحکام ایسا حصار ہے، جو ساری منفی دعوتوں سے بچاؤ کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔

راہ محبت کے بغیر نفس اور عقلی قوت ایسی چیز ہے، جس میں ہر خوبصورت دعوت کو قبول کرنے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہوتی ہے، اس طرح افراد علم، ذہانت اور استدلال کی صلاحیت کے باوجود باطل اور غلط دعوت کا نشانہ بن جاتے ہیں، اللہ سے والہانہ محبت ہر غلط اور باطل دعوت سے بچاؤ کے لئے حصار کی حیثیت رکھتی ہے۔

دوسری صورت میں افراد کا ذہنی سانچہ ایسا بن جاتا ہے، جس میں ہر غلط دعوت کو قبول کرنے کی ان میں استعداد موجود ہوتی ہے۔

اللہ ہمیں اپنی محبت کی راہ نصب فرمائے اور اپنے رسول کی اطاعت اور اپنے دوستوں کی صحبت ومعیت نصیب فرمائے ۔ (آمین)

(۵۶) موجودہ دور میں مادیت پرستی کا طوفان اتنا ہمہ گیر وہمہ جہتی ہے کہ اس طوفان کے اثرات سے بچنا ہما شما کے بس کی بات ہی نہیں، اہل علم ہو یا اہل دانش یا مذہبی فرد ہو، کوئی بھی ہو، اگر اس نے ذکر وفکر کے مجاہدوں سے باطن کی پاکیزہ بنیادوں پر تعمیر کا کام سرانجام نہ دیا ہو تو بے لگام خواہشات کے طوفان اور مادیت کے تھپیڑوں سے اس کے لئے بچنا دشوار تر ہے۔علم وعظ ونصیحت کی باتیں اور کتابیں اس ہمہ گیر بحران سے بچانے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

جدید طوفان، دنیا اور مادی حسن پر فریفتگی کا طوفان ہے، جس کا مقابلہ حقیقی اور معنوی حسن کے اجزاء سے بہرہ وری سے ہی ہوسکتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ صدیوں سے موجود اپنے روحانی نظام کے احیاء کی کوشش ہوں، تاکہ خواہشات نفس پر روحانی اور ملکوتی قوتوں کے غلبہ کی صورت پیدا ہو سکے۔

علم کی تحصیل کے لئے جو کوششیں ہورہی ہیں، وہ یقیناً قابل قدر ہیں، لیکن جب تک حقیقی خانقاہی نظام کی بحالی کی سنجیدگی سے کاوشیں نہ ہوں گی، محض علم کے ذریعہ معاشرے کو باطل نصب العینوں سے محبت اور ان پر وارفتگی کی حالت سے بچایا نہیں جا سکتا۔

حقیقی خانقاہوں کی جو خصوصیات ہماری تاریخ کا حصہ رہی ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں۔

- اللہ کی محبت کے نصب العین کو فروغ دینا۔
- اپنے حلقوں سے وابستہ افراد میں سادگی، قناعت، فقر اور تھوڑے پر راضی رہنے والا مزاج پیدا کرنا۔
- افراد میں اسلام پر عمل پیرا ہونے کی استعداد پیدا کرنا۔
- افراد معاشرہ میں خیرسگالی، رواداری، اور بُردباری جیسی صفات پیدا کرنا۔
- ایک دوسرے کے کام آنے اور باہمی دکھ درد میں شریک ہونے کا مزاج پیدا کرنا۔
- اللہ سے ملاقات کی فکر اور اس کے احساس کو غالب کرنا۔
- علم ومالداری کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی رعونت کو ختم کرنا۔
- سنگ دلی وقساوت قلبی کی جگہ نرمی ومحبت کے اوصاف کو فروغ دینا۔
- دنیادارانہ وسرمایہ دارانہ میلانات ورجحانات میں کمی لانا وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت اس طرح کا خانقاہی نظام وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے دوسری صورت میں معاشرہ ہولناک جرائم کا شکار ہو کر تباہی کا منظر پیش کرے گا، جو منظر اس وقت ہم اپنی آنکھوں دیکھ رہے ہیں، کوئی مادی فلسفہ اور مادی نوعیت کا نقشہ انسانیت کو اس ہولناک منظر سے بچا نہیں سکتا، انسانیت ماتم کے سے حالات دوچار ہوگی، بلکہ وہ دوچار ہو چکی ہے۔

اسلام کا پاکیزہ روحانی نظام ہی انسانیت اور خود ملت کو حیوانیت اور خودکشی سے بچا سکتا ہے، شرط یہ ہے کہ جس طرح ظاہری دینی تعلیم کو فیصلہ کن اہمیت دے کر اس کے لئے توانائیاں صرف ہورہی ہیں، اسی طرح اس کام کو بھی فیصلہ کن اہمیت دے کر اس کے لئے شعور پیدا کیا جائے اور فقیر منش درویشوں کی تیاری کے کام کو ترجیح دی جائے۔

ہماری تاریخ کے مشکل سے مشکل تر دور میں حکمرانوں اور عام لوگوں کو نفس پرستی اور دنیا پرستی کی دلدل سے نکالنے اور معاشرے کو فساد وبحران سے بچانے میں اہل اللہ نے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس وقت بھی وہ یہ کردار ادا کر سکتے ہیں، لیکن اس کے لئے عقلیت کی تیز لہروں کی جگہ دل کی صلاحیتوں کی بیداری اور محبت کی چاشنی سے بات کو زیادہ بلند آہنگی سے پیش کرنا ہوگا اور ذہن سازی میں اس کام کو خصوصی اہمیت دینا ہوگی۔

(۵۷) ہمارا تربیتی نظام جو صحابہ کرام کے بعد امت میں تشکیل ہوا، جو لگ بھگ بارہ سو سال تک مؤثر طور پر اپنا کردار ادا کرتا رہا، اس کی ایک بڑی خصوصیت تو یہ تھی کہ یہ انسانی نفس کی مکر وفریب کی چھوٹی بڑی ساری اداؤں سے آشنائی اور اس کی تہذیب وتربیت اور تحلیل نفس کی بہترین صورت تھا، اس کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس سے ہماری تہذیبی، روحانی اور اخلاقی اقدار وابستہ رہیں۔

تزکیہ وتربیت کے مقام پر جو اہل اللہ فائز رہے، ان کے حالات زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نفس کے خلاف ان تھک مجاہدوں سے کام لیتے رہے، اس سلسلہ میں بڑے بڑے اہل اللہ کے مجاہدے تو حیرت انگیز حد تک تھے، یہاں ہم صرف ایک اہل اللہ کے

مجاہدوں کے حالات بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

حضرت بایزید بسطامیؒ مشہور بزرگ ہیں، وہ لکھتے ہیں: میں بارہ سال تک خلوت میں نفس کے خلاف لوہا بنا رہا، اور نفس کو ریاضت کی بھٹی میں ڈال کر مجاہدہ کی آگ سے گرم کرکے ملامت کے ہتھوڑے سے کوٹتا رہا۔ آخر کار میں نے اسے آئینہ بنایا، پانچ سال آئینہ میں صرف ہوگئے اور طرح طرح کی عبادات وریاضات سے اس آئینہ کو صیقل کیا، پھر ایک سال اسے اغیار کی نظر سے دیکھا۔ پھر بھی اسے غرور اطاعت کے بھروسے اور عمل کی خودسری میں مبتلا دیکھا، پانچ سال اور کوشش کی پھر جب اسے دیکھا تو وہ مردہ تھا۔''

اسی طرح کے مجاہدے دوسرے بڑے اہل اللہ کے رہے ہیں، اب تک حقیقی اہل اللہ کے ہاں پندرہ بیس سال کے مسلسل مجاہدوں کے بغیر خلافت دینے کی روایت نہیں رہی۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے تزکیہ کا نظام جو خانقاہی صورت میں موجود رہا، وہ نفسی قوتوں کے خلاف کس قدر طاقتور اور جاندار نظام تھا۔

مجاہدوں کی اس بھٹی سے گزر کر اور پختہ ہونے کے بعد وہ جب عاشق حالت بقا میں آتا تھا اور دوسروں کی تربیت کے مقام پر فائز ہوتا تھا تو وہ بہتر سے بہتر تربیت اور سلیقہ وفراست سے طالبوں کو نفس پرستی کی قوتوں سے بچانے اور نفسی مراحل سے گزارنے میں اہم کردار ادا کرتا تھا، چونکہ وہ نفس کی چھوٹی بڑی ساری واردات سے گزرا ہوا ہوتا ہے، اس لئے وہ بصیرت وفراست سے دوسروں کی تربیت کا فریضہ سرانجام دیتا تھا۔

جب افراد معاشرہ اصلاح کی طلب سے اس طرح کے اہل اللہ کی صحبت میں آتے تھے تو وہ ایک نئی ایمانی زندگی اور عشق ومحبت کے طاقتور اثرات محسوس کرتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ ان کے نفس کی حالت میں تغیر برپا ہونے لگتا تھا، بالآخر وہ نفس مطمئنہ کے مقام پر پہنچ جاتے تھے، اگرچہ خلافت بمشکل چند افراد ہی کو ملتی تھی، اس لئے کہ دوسروں کی تربیت وتزکیہ کی صلاحیت کے حامل افراد کم ہی ہوتے تھے، لیکن قابل ذکر افراد کے نفس کی بہتر اصلاح ہوجاتی تھی۔

(۵۸) عبدالکریم عابد صاحب بیسویں صدی کی آخری نصف صدی کے پاکستان کے بہت بڑے دانشور صحافی تھے، جس طرح ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب فکر وفلسفہ میں علامہ اقبال کے بعد سب سے بڑے اسلامی فلسفی تھے، اسی طرح عبدالکریم عابد صاحب دنیائے صحافت میں ممتاز دانشور صحافی تھے، موصوف کے مضامین کا مرکز ملکی وعالمی صورتحال کے تجزیے کے ساتھ ساتھ ریاست اور معاشرے کے ستون فرد کی شخصیت ہے، اس شخصیت کی تعمیر کے بغیر ریاست ومعاشرے کی صحتمند خطوط پر تعمیر وتشکیل کا کام نہیں ہوسکتا، اس نکتہ پر ان کا زیادہ زور ہوتا تھا۔

موصوف نے انتقال سے پہلے مجھے ایک مکتوب لکھا تھا۔ اس مکتوب میں اکیسویں صدی میں انسانیت کی حالت زار اور روحانیت کی ضرورت کے موضوع پر زور دیا تھا۔ اس خط میں اگرچہ انہوں نے راقم السطور کے علمی کام کی تعریف بھی ہے، جو ان کا حسن ظن ہی تھا، اس خط کی اہمیت کے پیش نظر ہم یہاں اسے جوں کا توں دے رہے ہیں۔

۱۰ مئی ۱۹۹۹ء

برادرم محمد موسیٰ بھٹو صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا خط ملا، کتابیں اکثر ملتی رہتی ہیں، اردو کی بھی، سندھی کی بھی، ماشاء اللہ پچھلے تیس سال میں آپ نے اپنے قلم سے ایک کتب خانہ پیدا کر دیا ہے اور یہ لٹریچر سندھ کی نئی نسل کیلئے رہنما حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی فکر میں جمود نہیں، مسلسل ارتقا ہے اور یہ اچھا ہے کہ وقتی سیاسیات سے آپ مغلوب نہیں، مستقل اہمیت کے مضامین لکھ رہے ہیں اور اس کا محرک روحانی جذبہ ہے، جو آپ دوسروں میں بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور آپ کی تحریریں اس مقصد کیلئے بہترین ہیں۔

دنیا، مادہ پرستی اور نفس پرستی کے جس دور میں لادین سرمائیداری نظام کی وجہ سے داخل ہوئی تھی، اب اس کا خاتمہ قریب ہے، مغربی تہذیب اپنے دن پورے کر چکی ہے، اس کے بعد حالات المناک ہونگے اور انسان روحانیت کے دامن میں پناہ تلاش کرینگے، ویسے بھی مادہ پرستی انسان کو مستقلاً بے چین رکھتی ہے، ہزاروں خواہشیں ہوتی ہیں، ہر خواہش پر دم نکلتا ہے اور پھر بھی انسان کو محرومی کا احساس رہتا ہے۔ اب تو سرمائیداری نظام کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد لوگوں کیلئے جائز ضروریات کا حصول بھی مشکل ہوجائیگا، اگلی صدی میں اناج کا قحط ہوگا، پانی کی قلت ہوگی، وباؤں کا زور ہوگا، یہ حالات دنیا پرستی کے کسی فلسفے کو چلنے نہیں دینگے، انسان کو

ایسے فلسفے کی ضرورت ہوگی، جس میں وہ کم ضروریات کے ساتھ جینا سیکھے اور جو اس میں سادگی اور قناعت پیدا کرے۔

سرمائیداروں کی صنعتی تہذیب نے جو بہت سی مصنوعی صنعتیں پیدا کردی ہیں، وہ دم توڑ دینگی، زراعت پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی، تاکہ انسان اپنے کھانے کا اناج حاصل کر سکے۔ سرمائیکاری، تعشیات کی صنعتوں کی بجائے حقیقی ضروریات کے شعبہ میں ہوگی اور اس کے نتیجہ میں کلچر بدل جائیگا اور اس نئے کلچر کو سہارا دینے کیلئے خدا پرستی پر مبنی روحانیت کے نظریے کی ضرورت ہوگی، اس لیے جو کام آپ یا دوسرے لوگ روحانی اخلاقی اقدار کیلئے کررہے ہیں، وہ ضائع نہیں ہوگا اور مستقبل کی دنیا کیلئے اثاثہ ہوگا اور خدا کرے کہ اس نوعیت کے کام کیلئے آپ کے زورِ قلم میں اضافہ ہوتا رہے۔ خدا آپ کو دین ودنیا کی برکتیں عطا کرے۔

والسلام

عبدالکریم عابد

اس تجزیہ میں ایک بات جو کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ سرمایہ داری کے پیدا کردہ یہ حالات دنیا کے کسی مادی فلسفہ کو چلنے نہیں دیں گے، انسانیت بالآخر خدا پرستی پر مبنی روحانیت کی تلاش پر مجبور ہوجائے گی۔

یہ حالات انسانیت کو تیزی سے اس راہ پر لارہے ہیں، سوشل میڈیا نے انسان کے حیوانیت کے اس سفر کو تیز کرکے شرف انسانیت کی طرف جانے والے راستے بند کردیئے ہیں، مادیت کی اس انتہا سے ہی انشاء اللہ خدا پرستی پر مبنی روحانیت کا سفر شروع ہوگا۔

مادیت پرستی کی تیز لہر نے مغرب میں جو صورتحال پیدا کی ہے، اس کا اندازہ درج ذیل اخباری رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے، یہاں یہ رپورٹ دینے کا مقصود یہ ہے کہ معلوم ہوکہ ممتاز دانشور صحافی نے بیس سال پہلے مادہ پرستی کے حالات کسی مادی فلسفہ کو چلنے نہیں دیں گے کا جو بصیرت افروز تجزیہ کیا تھا، وہ تجزیہ کتنا صحیح تھا۔

معروف برطانوی جریدے انڈی پینڈنٹ نے ایک رپورٹ میں انکشاف کیا ہے کہ انگلینڈ اور ویلز کا جائزہ لیا جائے تو علم ہوتا ہے کہ ۲۰۱۰ کی نسبت ۲۰۱۸ تک نوجوانوں اور نابالغوں میں خودکشی کے واقعات میں ٦٧ فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے، سماجی اور سماجی سائٹس کے برطانوی ماہرین نے نابالغوں کی اموات کا براہ راست ذمہ دار سوشل میڈیا کو قرار دیا ہے کہ اس میں طلبا وطالبات اور نوجوان اپنی یاسیت اور گھریلو ڈپریشن کے سبب خود کو ناکام عاشق اور انتہائی غمزدہ محسوس کرتے ہیں اور سوشل سائٹس پر پیغامات اور تصاویر سمیت دیگر عناصر کے سبب خودکشی کرلیتے ہیں۔ کئی سماجی ماہرین نے بتایا ہے کہ خود کو دوسروں کی نسبت اچھا اور خوبصورت دکھائی دینے میں ناکام بچے یاسیت اور ڈپریشن کا شکار ہوجاتے ہیں۔ جبکہ سماجی رابطوں کی سائٹس پر منفی تبصروں نے بھی نوجوانوں اور بچوں میں خودکشی کے رجحانات پیدا کرنے میں مدد دی ہے۔

ڈیلی میل آن لائن کے مطابق برطانوی ہیلتھ سروس نے تصدیق کی ہے کہ سوشل سائٹس پر خود کو نقصان یا جسمانی زخم پہنچانے والی پوسٹوں کے زیر اثر زخمی ہونے والی لڑکیوں کی تعداد مسلسل تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۰۰۹ میں خود کو جسمانی نقصان پہنچانے یا خودکشی کی کوشش کرنے والی لڑکیوں کی تعداد ۷،۳۲۷ تھی۔ سال ۲۰۱۷ میں یہ تعداد ۱۳،۴۶۳ رہی۔ جبکہ اگلے سال خودکشی کی کوشش میں زخمی ہونے والی لڑکیوں کی تعداد ۱۴،۸۷۶ سے بڑھ گئی ہے۔ ادھر آسٹریلیا سے ملنے والی اطلاعات میں بتایا گیا ہے کہ محض دو ہفتے کے مختصر دورانیے میں پانچ لڑکیوں نے خودکشی کی ہے اور اپنی خودکشیوں کا سبب سوشل سائٹس پر مخالف بچوں کے کمنٹس کو قرار دیا ہے۔ اس نئی افتاد کے بارے میں آسٹریلوی حکومت نے ماہرین کے ایک پینل کی مدد طلب کی ہے اور کہا ہے کہ سوشل سائٹس کے خودحس رجحانات کو کم کرنے کیلئے فوری تجاویز دیں۔ آسٹریلوی شہر پرتھ سے تعلق رکھنے والی اور موت کو گلے لگانے والی پانچویں لڑکی روشیل نے فیس بک پر مخالف بچوں کے کمنٹس سے پریشان ہوکر خودکشی کی۔ اپنی اس حوالہ سے تحریر میں روشیل نے لکھا کہ اگر میں اس دنیا سے چلی جاؤں تو یقینی اچھا ہوگا۔ آسٹریلوی حکومت نے بچوں میں سماجی رابطوں کی سائٹس کی وجہ سے ہونے والی خودکشیوں کے واقعات کی روک تھام کیلئے ویب سائٹ لانچ کی ہے اور اس حوالے سے اساتذہ اور والدین کو بچوں کے رویوں پر نظریں رکھنے کیلئے کہا ہے۔

برطانوی ادارے آفس آف نیشنل اسٹیٹکس نے تصدیق کی ہے کہ ۲۰۱۸ میں ۱۹۲ کم

سن نوجوانوں اور طلبا وطالبات نے خودکشی کرکے اپنی جانیں لے لی ہیں۔ جبکہ ۲۰۱۰ میں یہی تعداد ۱۱۰ تھی۔ ماہرین نے نابالغوں میں خودکشیوں کے حوالے سے سوشل سائٹس کے کردار کو اہم ترین قرار دیا ہے۔ سوشل سائٹس اور خودکشی کے باہمی تال میل کے تازہ منظر نامہ پر لیبر پارٹی کی شیڈو منسٹر باربرا کیلی نے ایسے واقعات اور بچوں کی ہلاکت کو قومی اسکینڈل قرار دیا ہے، جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ صرف لندن میں گزشتہ پانچ برسوں میں نوجوانوں میں خودکشی کا تناسب ۱۰۷ فیصد بڑھ چکا ہے۔ واضح رہے کہ اقوام متحدہ کے عالمی ادارے یونیسیف نے ایک تازہ رپورٹ میں بتایا ہے کہ آئرلینڈ دنیا بھر میں سب سے زیادہ سوشل سائٹس سے منسلک اموات والا ملک بن چکا ہے، جس سے گھبرا کر آئرش حکومت نے متعدد کمپنیوں کے ساتھ ایسے معاہدے کئے ہیں، جن میں نوجوانوں کو خودکشی سے بچانے کیلئے ان کی کاؤنسلنگ کی خاطر متعدد سافٹ ویئر اور ایپلی کیشنز تیار کروائی ہیں۔ ان کو ہنگامی طور پر بنوایا گیا ہے، تاکہ بچوں میں خودکشی کے جذبات کو ابھرنے سے روکا جا سکے اور ان کو بتایا جا سکے کہ وہ اکیلے نہیں، پورا معاشرہ ان کے ساتھ کھڑا ہے۔''

یہ رپورٹ اس اعتبار سے بڑی المناک ہے کہ مادی تہذیب اور اس کی میڈیا نے انسانیت کو کس قابل رحم مقام پر لاکھڑا کیا ہے کہ چھوٹی بچیاں تک تلملا اٹھی ہیں اور زندگی سے آخری حد تک بیزاری کی راہ پر گامزن ہیں اس اعتبار سے اس وقت انسانیت بہت زیادہ رحم، توجہ اور ہمدردی کی مستحق ہے اور اس قابل ہے کہ اسے اسلام کے روحانی نظام سے آشنا کیا جائے، مسلمان اگر اس وقت انسانیت کے کام نہیں آئیں گے تو کب کام آئیں گے، لیکن مسلمانوں کا یہ المیہ خود کوئی کم المیہ نہیں ہے کہ بہترین تہذیب کا حامل ہونے کے باوجود وہ مغربی تہذیب کے سحر میں مبتلا ہیں اس سے اوپر اٹھنے کے لئے تیار نہیں۔

(۵۹) دور جدید میں امت کو بہت سارے چیلنج درپیش ہیں، جنہیں سمجھکر بہتر حکمت عملی سے ان سے عہدہ برآ ہونا ہے، ایک بڑا چیلنج تو یہ ہے کہ رواجی معاشی نظام تعلیم جو انگریز کا مسلط کردہ ہے، اس میں دنیا پرستی، مادیت پرستی، نفس پرستی اور لادینیت کا زہر موجود ہے، اس نظام تعلیم کا حصہ بننے والی نسلوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ مغربی فکر اور مغربی تہذیب کی اسیر ہوجاتی ہیں اور مسائل حیات کے بارے میں ان کا نقطہ نگاہ عام طور پر مادہ پرستی پر مبنی ہوتا ہے اور مادی دنیا ان کی مقصود بن جاتی ہے، ہمارے معاشرے میں ہر طرف نفسانفسی، چھینا جھپٹی، دھوکہ دہی، لوٹ مار، انسان آزاری اور سنگ دلی کی جو فضا موجود ہے، جو تیزی سے بڑھتی جارہی ہے، وہ سب اسی لادینی نظام تعلیم ہی کا نتیجہ ہے، اس نظام کو پوری طرح بدلے بغیر معاشرے کو کسی بھی طور پر ہمہ گیر فساد سے نہیں بچایا جا سکتا، اس لئے کہ دنیا اور نفسی خواہشات کو مقصود بنانے کا جو سبق دس پندرہ سال تک طالب کو ملے گا تو اس کے لئے نفس پرستی اور مادیت پرستی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر اللہ اور اس کے دین کے لئے طبعی مناسبت کا پیدا ہونا کس طرح ممکن ہے؟

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمارا سرکاری نظام تعلیم ہو یا پرائیویٹ تعلیمی ادارے، وہ سب مادیت اور نفسی خواہشات کو تیز سے تیز تر کرنے کا ذریعہ بن گئے ہیں اور بچوں کی نظری اور روحانی قوتوں کی بربادی کا موجب بھی۔

جب تک باصلاحیت افراد سرکاری اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے ذریعہ نظام تعلیم میں اپنی پاکیزہ تہذیب کی روح کو شامل کرنے کے لئے کوشاں نہ ہوں گے، تب تک ہمارا اجتماعی نظام فساد ہی سے دوچار رہے گا اور اصلاح کی ساری کوششیں ناکامی سے دوچار ہوں گی اور معاملہ چند افراد کی اصلاح سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔

یہ کتنی المناک بات ہے کہ اس چیلنج نے ہمارے معاشرے کے اجتماعی ضمیر کو مردگی تک پہنچایا ہے اور حق صداقت اور سلیقہ انسانیت کی بات سننے سے بیزاری تک معاملہ پہنچ گیا ہے، لیکن جدید تعلیم سے وابستہ دیندار افراد کی طرف سے اس محاذ پر رسمی نوعیت کی جزوی تبدیلیوں سے زیادہ کوئی کام نہ ہو سکا ہے اور نئے نئے ناموں سے قائم ہونے والے جدید تعلیمی ادارے لادینیت اور مادیت پرستی ہی کے اسی زہر کو مزاج میں سرایت کرنے کا موجب ہیں۔

دوسرا چیلنج جسے سمجھنا ازحد ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ اس دور میں جدیدیت کی تحریکوں کے زیر اثر عقلی صلاحیتیں، دل کی حسوں اور اس کی صلاحیتوں پر غالب ہوگئی ہیں، جس کی وجہ سے دل کی پاکیزہ محبت کی حسیس دب گئی ہیں، اور وہ حالت پیدا ہوگئے ہیں جسے قرآن نے درج ذیل آیت کی صورت میں بیان فرمایا ہے۔

قالت الاعراب آمنا قل لن تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم . (یہ

دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ تم کہو کہ تم نے اسلام قبول کیا ہے ایمان تو ابھی تمہارے دل کی (گہرائیوں میں) داخل ہی نہیں ہوا)۔

حقیقت یہ ہے کہ عقلیت کی تیز تر فکر اور عقلیت کی تحریکوں نے دل کی صلاحیتوں کو سلا دیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ زندگی میں حقیقی تبدیلی پیدا نہیں ہو پاتی، عشق ومحبت کی دنیا وا نہیں ہوتی، زندگی معنوی حسن سے آشنا نہیں ہوتی اور سوز دوروں اور رقت قلبی پیدا نہیں ہوتی۔

ضرورت ہے کہ دل اور عقل کے درمیان توازن کی صورت پیدا ہو۔ دونوں کے درمیان توازن سے ہی جدید چیلنج سے مقابلہ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے، یک طرفہ صلاحیتوں یعنی محض عقل یا محض دل سے یہ صلاحیتیں پیدا نہیں ہو سکتیں۔

یہ اہم نکتہ ہے جسے اہل فکر واہل نظر کو سمجھنا ضروری ہے۔

(۶۰) موجودہ دور میں مزاجوں اور طبیعتوں کی جس طرح سے تشکیل اور نشوونما ہوئی ہے، اس میں مادیت کا عنصر غالب ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ دلوں کی شادابی، روحوں کی بالیدگی، اندر میں غوطہ زنی، معنوی حسن سے بہرہ وری، محبوب حقیقی سے والہانہ محبت، آتش عشق میں جلنے، اپنی دولت میں اللہ کی بے کس مخلوق کو حصہ دار بنانے، عبادت اور ذکر وفکر کے ذریعہ باطن کو جلا دینے، اور انسانیت کا درد اور اس کی خدمت کی باتیں ایسی ہیں، جن کے سننے پر آمادگی موجود نہیں، ان باتوں سے طبیعتوں میں انشراح تو کیا، بیزاری پیدا ہونے لگتی ہے۔

یہ دراصل مادہ پرستی کی عمومی فضا کا اثر اور اس کا نتیجہ ہے، انسانیت دیکھتے ہی دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گئی، آج سے پچاس سال پہلے تک مزاجوں اور طبیعتوں میں نرمی، محبت، رواداری، شفقت، اور خیر کی باتیں سننے کی رغبت موجود تھی اور ان باتوں کا اثر بھی ہوتا تھا، لیکن اب اچانک فضا بدل جانے کی وجہ سے دل کی ویرانی، روحوں کی بے چینی، دماغوں کا انتشار، اور نفسیات میں فساد ایسا عام ہوا ہے کہ معاشرہ اس فساد ہی سے عبارت ہو گیا ہے۔

(۶۱) تصوف جو صدیوں سے امت میں تزکیہ وتربیت کا کردار ادا کرتا رہا ہے، عصر حاضر میں اس کی بے توقیری اور معاشرے میں اس کی قدر وقیمت اور وقعت میں کمی کے کافی اسباب ہیں، اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ غیر معمولی مجاہدوں سے نفس کی مکمل طور پر پامالی سے پہلے ہی اس منصب پر فائز ہونے کی روش عام ہوئی ہے، اور خلافتیں عطا فرمانے میں بہت زیادہ فیاضی کا مظاہرہ ہوا ہے۔

اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ درگاہی سسٹم نے خانقاہی سسٹم پر ضرب کاری لگائی ہے، اس طرح اکابر بزرگوں کی جگہ ان کی نااہل اولاد نسل درنسل اس منصب پر فائز ہوتی رہی ہے، جس طرح جاگیردار کی زرعی زمین کے ساتھ ساتھ اس کے کسان بھی وراثۃ اولاد میں منتقل ہوتے رہتے ہیں، وراثت کا یہی سلسلہ روحانیت کے اس پاکیزہ ادارہ سے بھی وابستہ ہوا، مرید اولاد کو وراثت کے طور پر منتقل ہوتے رہے ہیں، اولاد چاہے تصوف کی ابجد سے بھی واقف نہ ہو، لیکن وہ بزرگوں کی اس روحانی وراثت کو اپنا حق شمار کرتی ہے۔

تصوف سے وابستہ عہد جدید کے بیشتر بزرگوں کے ہاں حقیقی روحانیت کی بجائے شان مان کی زندگی کی نمود ہے، مالداری اور سرمایہ داری کی ایک دوڑ ہے، جس کا تصوف وبزرگی کے نام پر سلسلہ جاری ہے، تصوف جس کی امتیازی علامت فقر محمدی اور دنیا سے استغنا وبے نیازی رہی ہے، موجودہ تصوف اس کے برعکس جاگیرداری وسرمایہ داری میں تبدیل ہو گیا ہے، تصوف کے نام پر وجود میں آنے والی نئی خانقاہیں اور اس کے مسند نشین بھی اس کاوش میں مصروف ہیں کہ انہیں شہرت حاصل ہو، زیادہ سے زیادہ مرید ملیں، ان کے دولتمندوں سے تعلقات مستحکم ہوں، تاکہ وہ جدید دور کی زیادہ سے زیادہ آسائشوں سے متمتع ہو سکیں اور سرمایہ دار بننے کی ان کی حسرت پوری ہو۔

اہل تصوف کا دولت ودنیا کو مقصود بنانا اس دور کا بڑا المیہ ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ عالم، دین کے امین ہیں، لیکن جب وہ مالداروں سے (دوستانہ) تعلقات قائم رکھیں گے تو وہ دین کے رہزن بن جائیں گے، اسی طرح آپ ﷺ نے دوسری حدیث میں فرمایا کہ جس طبقہ اور گروہ میں دولت آئے گی، وہاں دشمنی پیدا ہوگی۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس وقت ملک بھر کی بیسیوں درگاہیں جہاں اکابر بزرگوں کی اولاد در اولاد املاک وجائداد پر ایک دوسرے سے دست وگریباں ہے۔

(۶۲) اکابر بزرگوں نے قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں بھی دنیا کے بارے میں بہت سے انتباہات دیئے ہیں، جو ان کی کتابوں میں موجود

ہیں یہاں کچھ اقوال پیش کئے جاتے ہیں۔

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں جو درویش تونگری (مالداری) کے آس پاس پھرے وہ ریاکار ہے جو بادشاہوں سے آمدورفت رکھے وہ چور ہے۔

عبداللہ محمد مغربیؒ فرماتے ہیں: انسانوں میں سب سے زیادہ ذلیل وہ درویش ہے جو دولتمندوں کی خوشامد کرے۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ فرماتے ہیں درویش کا فاقہ اس کے اختیار میں ہے، اسے دنیا دی گئی ہے کہ جس طرح چاہے خرچ کرے، وہ اپنے لئے بھی خرچ کرسکتا ہے۔مگر وہ ایسا نہیں کرتا، بلکہ دوسروں کو دنیا دیتا ہے اور خود فاقہ کرتا ہے، جس سے اس کے کام میں ترقی ہوتی ہے (یعنی درویش کی ترقی فقر سے وابستہ ہے)۔

فرد جب تک دنیا میں مشغول رہتا ہے، وہ خدا رسیدہ نہیں ہوسکتا۔

حضرت فرید الدین شکر گنج ؒ فرماتے ہیں درویش کے لئے سب سے زیادہ مضر چیز دولتمند کی صحبت ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں، جس نے مخلوق کی طرف منہ کیا، اس نے گویا خالق کی طرف سے پیٹھ پھیر لی۔

دنیا کو دل سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لو یعنی دولت کماؤ، مگر اسے ہاتھ میں ہی رکھو،اسے دل پر قبضہ کرنے نہ دو۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں، دولت وہی شخص طلب کرتا ہے جسے اللہ ذلیل کرے۔

حضرت حسن بصریؒ نے حضرت سعید بن جبیرؒ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا، تین کام کبھی نہ کرنا (۱) بادشاہوں کی بساط پر کبھی قدم نہ رکھنا، اگرچہ وہ شفقت کریں (۲) کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ بیٹھنا خواہ وہ رابعہ وقت ہو اور تو اسے کتاب اللہ کی تعلیم دیتا ہو (۳) مزامیر نہ سننا، اس لئے کہ یہ آفت ہے۔

فقیہ وہ ہے جو دنیا سے کنارہ کش ہو، جس نے دولت کی عزت کی، اللہ نے اسے ذلت دی۔ دنیا تمہاری سواری ہے، اگر تم اس پر سوار ہوگئے تو یہ تمہیں لئے چلے گی، اگر وہ تم پر سوار ہوگئی تو وہ تمہیں ہلاک کرکے چھوڑے گی۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں: جب تک دنیا کی طلب دل سے نہیں نکلے گی، تب تک شیطان کے مکر وفریب سے بچنا دشوار ہی نہیں، محال ہے نیز جب تک وہ چیزیں جو دنیاداروں کو پسند ہیں، دل میں ان سے کراہت کی حالت پیدا نہ ہو، تب تک نفس نہیں سنورے گا۔

جن کے دلوں میں دنیا کی چیزوں کا شوق ہے اور دنیا کی راحت وزینت کی خواہش موجود ہے، وہ خوف اور بھوک، جان ومال کے نقصانات کے خطرات کی گھاٹیوں سے نہیں نکل سکیں گے (یعنی وہ غربت وافلاس اور دنیا کی مستقبل کی بہتری کے لئے حیران وسرگردان رہیں گے)۔ **(مولانا سعید احمد خان)**

اگرچہ ضرورت کی حد تک دنیا ہو تو اس میں کوئی ہرج نہیں، لیکن شان مان کی زندگی، مادی آسائش اور سامان کی چیزیں، سرمایہ دارانہ ومالدارانہ طرز زندگی وغیرہ اہل تصوف کے ہاں اس کی گنجائش موجود نہیں، اس لئے کہ اس کے بغیر افراد معاشرہ کے لئے آئیڈل زندگی کا نمونہ پیش نہیں ہوسکتا، اور عام لوگ جو بنیادی ضروریات زندگی سے بھی محروم ہوتے ہیں، ان کی دل جوئی کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔ ویسے بھی درویشوں کے ہاں چند دنوں کے زندگی کی راحت کے سامان کی اہمیت نہیں ہوتی۔ پھر سرمایہ داروں ومالداروں سے مشابہت اور ان کی پسندیدہ چیزوں سے تعلق خاطر بہت سارے مضرات کا موجب ہے۔اس لئے حقیقی اہل اللہ ہر صورت میں فقر کی زندگی ہی پر مطمئن اور قانع رہتے ہیں۔

(۶۳) ذیل میں نفس کی حالت اور خود احتسابی کے بارے میں بعض بزرگوں کے اقوال پیش کئے جاتے ہیں، یہ ایسے اقوال ہیں، جو آئینہ کی حیثیت رکھتے ہیں، جس میں ہم اپنی تصویر کو دیکھکر چہرے پر لگے ہوئے داغوں کو صاف کر سکتے ہیں۔ یہ اقوال دل اور نفس کی انتہائی گہرائیوں سے تعلق رکھتے ہیں، ان اقوال کو دیکھکر جب ہم اپنے نفس کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نفس کی سرکشی تو زوروں پر ہے اور اصلاح کے بارے میں ہمارا قدم تو ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ بزرگوں کے یہ اقوال ہمیں جھنجھوڑ کر، بیدار ہونے اور خود احتسابی سے کام لے کر آخر وقت تک نفس کو مہذب بنانے کے مجاہدوں کے لئے اکسانے کا ذریعہ ہیں۔ بالخصوص جب نفس خودسری کی حالت میں آتا ہے تو اس وقت

بزرگوں کے بیان کردہ یہ نکات ہمارے لئے انتہائی رہنما ثابت ہوتے ہیں اور ہمیں خود سری کی حالت سے نکال کر خود احتسابی کی حالت میں لاتے ہیں، اور اللہ کے سیاہ کار اور عاجز ترے کی حیثیت سے زندگی گزارنے میں زبردست معاون ثابت ہوتے ہیں، وہ جو کہا گیا ہے کہ بزرگوں کے حالات وواقعات واقوال نفس اور نفسی قوتوں کے خلاف آلات وہتھیار کی حیثیت رکھتے ہیں، بالکل صحیح کہا گیا ہے، بزرگوں کے مجاہدے اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ نفس کے سارے اسرار ورموز ان پر کھل جاتے ہیں، وہ اپنے ذاتی مشاہدوں کے ذریعہ نفس کے حقائق اور اس کی گھاٹیوں سے آشنا کر کے ہماری رہنمائی کررہے ہوتے ہیں۔

بزرگوں کے ان رہنما نکات سے استفادہ کرکے نفسی قوتوں وخواہشوں کو پامال کرنے اپنی دنیا وآخرت بنانا اور اللہ کی رضا کے مقصود کو حاصل کرنا سب سے بڑی دانشمندی ہے، یہ مشاہدہ کی بات ہے کہ زندگی کے جس مرحلے پر بھی نفس کی سرکشی سامنے آئے اور خودسری، احساس برتری اور دوسروں کی تحقیر کے نفسی احساسات پیدا ہونے لگیں تو بزرگوں کے بیان کردہ ان نکات کے مطالعے سے وہ تاثیر پیدا ہونے لگتی ہے کہ بندے کی حالت میں از خود تبدیلی آنے لگتی ہے اور نفس حالت اعتدال میں آنے لگتا ہے، بزرگوں کے ملفوظات اور اقوال کی تاثیر کا صحیح معنیٰ میں اندازہ اسی وقت ہوتا ہے۔

یہ بات ویسے بھی واضح ہے کہ صاحب حال شخصیتیں صاحب قال افراد کے لئے جھنجھوڑنے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے، بشرطیکہ بزرگوں کی بزرگی کا نقش دل میں موجزن ہو۔

غیرمعمولی مجاہدوں سے نفس کو مہذب بنانے کے بعد چونکہ دل میں ہمہ وقت انوار الٰہی کا غلبہ موجود ہوتا ہے، اس لئے ایسے بزرگوں کی باتیں طالبوں کے لئے اکسیر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس توضیح کی بعد چند اقوال پیش کئے جاتے ہیں، جن سے ہمیں اپنے دل کو گرماتے رہنے کا کام لینا چاہئے۔

جونفس کو تعلیم نہیں دے سکتا، وہ دوسروں کو تعلیم دینے کی سعی نہ کرے۔ (حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ)

جب تک بندے کے ساتھ خواہشوں میں سے کوئی خواہش اور اپنی مشیتوں میں سے کوئی مشیت موجود ہے، اس وقت تک وہ اللہ تک نہیں پہنچ سکتا ۔ (ابوالحسن شاذلیؒ)

جب اللہ تعالیٰ کسی سے مواخذہ کرتا ہے تو اسے اپنے کاموں سے الگ کرکے نفس کے کاموں میں لگا دیتا ہے۔ (معروف کرخیؒ)

جوشخص اپنے نفس سے مطمئن ہے وہ سب سے زیادہ ہلاکت کے خطرے سے دوچار ہے۔ (احمد بن عاصمؒ)

جب تک فرد اپنے اورنفس کے درمیان دیوار کھڑی نہیں کرتا وہ نیاز اور نماز کی لذت سے آشنا نہیں ہوسکتا۔ (بشر حافیؒ)

اپنے عیوب اور کسی کو نظر نہیں آتے سوائے اس شخص کے جو ہر وقت اپنے آپ کو ملامت کرتا رہتا ہے۔ (عثمان الحیریؒ)

مہذب نفس کے حامل شخص کو چار چیزوں سے بچنا چاہئے۔ اول لوگوں کے عیوب تلاش کرنے سے دوم ایسی باتیں سننے سے جو سننے کے لائق نہیں، سوم ایسی باتیں جو کہنے کے لائق نہیں، ان کے کہنے سے چہارم ایسی جگہ جانے سے جہاں مناسب نہ ہو۔ (حضرت فرید الدین شکر گنجؒ)

اللہ تعالیٰ کی کسی بندے سے اعراض (دوری) کی علامت یہ ہے کہ اسے ایسی چیزوں میں مصروف رکھا جائے جو اس کے لئے غیر نفع بخش ہوں۔ (خواجہ محشاد علوؒ)

بندہ کمال کو اسی وقت پہنچتا ہے جب وہ اپنے عیبوں کو پہنچانے اورمخلوق سے کسی قسم کی طمع نہ رکھے۔ (بایزید بسطامیؒ)

(۶۴) سلیقہ انسانیت کے لئے عبدیت کا استحضار اور آداب بندگی کی بجا آوری ضروری ہے، چونکہ بندہ کی آداب بندگی لامحدود ہے، اس لئے راہ محبت میں تراش خراش بہت ہے، یعنی اندر کی دنیا میں ڈوبتے رہنے کا عمل مسلسل کی دنیا ہے جو نہ ختم ہونے والا ہے، بندہ کسی حالت پر بھی مطمئن نہیں ہوتا کہ اب آداب بندگی اور اس کے حقوق پورے ہوگئے نیز اب وہ خوف وخطر سے محفوظ ہوگیا ہے۔ اس لئے اس راہ میں مسلسل چلنا پڑتا ہے، اپنے حالات کی نگرانی کرنی پڑتی ہے اورنفس کا لگاتار محاسبہ کرنا پڑتا ہے، جہاں بھی طالب نے یہ محسوس کیا کہ اب اس کی اصلاح ہوگئی ہے، وہاں وہ غیرمحسوس طور پر گرنا شروع ہوجاتا ہے،

بندے کا معاملہ چونکہ اللہ سے ہے، اس لئے وہ کسی بھی لمحہ اور زندگی کے کسی بھی مرحلے پر اللہ سے بے خوف وبے نیاز نہیں ہوسکتا، اس کی ساری ترقی اور فوز وفلاح اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ چوکنا اور محتاط رہے اور نفس کا محاسبہ کرتا رہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں خوداحتسابی کا عمل آسان ہوجاتا ہے اور رجوع الی اللہ کا ملکہ مستحکم ہوجاتا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ نے بہت اہم نکتہ لکھا ہے:

عارفوں کو عظمت الٰہیہ کی ہیبت سے خوف ہوتا ہے، ان سے یہ خوف کبھی زائل نہیں ہوتا، اس لئے کہ عارفوں کے سامنے عظمت رب کبھی زائل نہیں ہوتی۔

سلیقہ انسانیت کا بحران دراصل نفس انسانی کے مدوجزر سے تعلق رکھتا ہے، نفس، جب حالت امارہ میں ہوتا ہے تو یہ بحران سنگین ہوجاتا ہے، ایسا معاشرہ جس میں نفس امادہ کے حامل افراد غالب ہوں تو وہ معاشرہ انسانیت کے سنگین بحران سے دوچار ہونے لگتا ہے۔

معاشرے کو سلیقہ انسانیت کے بحران سے بچانے کی صورت یہی ہے کہ تعلیم وتربیت کے ذریعہ اس میں ایسی روح پھونکی جائے، جس سے وہ نفس کی حالت میں تغیر کے لئے جدوجہد پر آمادہ ہوجائیں۔ جو افراد راہ محبت میں داخل ہوکر نفس کے خلاف مجاہدوں میں مصروف ہوتے ہیں ان کے نفس میں تغیر برپا ہوکر وہ نفس لوامہ میں داخل ہوجاتے ہیں۔

(۶۵) مجاہدوں سے نفس کی دنیا میں تہلکہ برپا ہونے لگتا ہے، وسوسوں اور خیالات کا ہجوم ہونے لگتا ہے، کیفیات میں تبدیلی اور ادل بدل کا نہ تھمنے والا عمل شروع ہوجاتا ہے، جو طالب کی نفسی قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی شروع کرنے کی سب سے بڑی علامت شمار ہوتی ہے۔

طالب عام طور پر وسوسوں اور نئے نئے خیالات کی آمدورفت سے گھبرا جاتے ہیں اور ذہنی یکسوئی نہ ہونے کی وجہ سے پریشان ہوجاتے ہیں، ایسے طالبوں کو یہ نکتہ سمجھنا چاہئے، بلکہ اس نکتہ کا مسلسل استحضار ہونا چاہئے کہ وسوسے، خیالات کا ہجوم اور کیفیات کا ادل بدل دراصل نفسی قوتوں سے مقابلے کا نتیجہ ہوتا ہے، ایسے طالب ایک اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ انہیں نفس سے معرکہ آرائی کرکے، اسے پوری طرح اللہ ورسول کی اطاعت میں دیدینے اور راہ محبت میں چلتے رہنے کی سعادت عظمٰی نصیب ہوئی ہے، دوسرا نکتہ جسے سمجھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جب تک نفس کے اندر موجود گندگی کی بڑی حد تک صفائی نہ ہوگی، تب تک نفس کی گہرائیوں میں موجود ظلمات وکدورتیں، نفسی آلائشیں وسوسے اور منفی خیالات کی آئے دن کی لہروں سے بچنا دشوار ہوگا، اس لئے طالب کو چاہئے کہ نفس کی اندرونی دنیا میں موجود اس تغیر کو حقیقت کی حیثیت سے قبول کرے کہ یہ تہذیب نفس اور تزکیہ نفس کے لوازمات میں سے ہے، جب نفس کا بت خانہ بڑی حد تک ٹوٹ جائے گا اور تزکیہ میں بڑی حد تک پیش قدمی ہوگی تو اس کے بعد ہی باطن کی وسیع دنیا میں ٹھہراؤ اور طمانیت پیدا ہوگی اور وسوسے اور خیالات کی آمدورفت اور منفی جذبات واحساسات کا سلسلہ از خود تھم جائے گا۔

بزرگوں کا بیان کردہ یہ نکتہ طالبوں کی حوصلہ افزائی کے لئے کافی ہے کہ جب وہ عطا فرمانا چاہتا ہے، تب ہی تو اس نے اپنا دروازہ کھٹکھٹانے اور اندر داخل ہونے کی راہ نصیب فرمائی ہے، اگر محروم رکھتے تو یہ توفیق ہی نصیب کیوں فرماتے؟

(۶۶) فرد کے مہذب بننے کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ وہ لوگوں سے اپنے جھگڑوں کو یک طرفہ پر ختم کرکے، ان کے ساتھ صلح ومحبت سے رہنے کے لئے کوشاں ہو۔

فرد جس معاشرے میں رہ رہا ہے، وہاں مزاج کا اختلاف، رائے کا اختلاف، سوچ کا اختلاف فطری بات ہے، نفس اور شیطان کی چاہت یہ ہے کہ یہ اختلاف بڑھکر تنازع کی صورت اختیار کرے، نفس کو ڈھیل دینے اور عدم خود احتسابی کے نتیجہ میں اکثر یہی ہوتا ہے کہ اختلاف سے جھگڑے اور دشمنی پیدا ہونے لگتی ہے۔

اس طرح افراد معاشرہ کی الجھنوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے، اور معاشرے کی وحدت بُری طرح متاثر ہونے لگتی ہے۔ ایک اختلاف مفادات اور انانیت کی وجہ سے ہوتا ہے، جو زیادہ انتشار کا موجب ہوتا ہے، دوسرا اختلاف مزاج کے فرق کی وجہ سے ہوتا ہے، اگرچہ یہ اختلاف زیادہ نقصاندہ نہیں ہوتا، تاہم اس سے الجھنیں اور تلخیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اسلام واضح فرماتا ہے۔ **فاالتقوالله واصلحوا ذالک بینکم** . پس اللہ سے ڈرو باہم ایک دوسرے کے ساتھ صلح کے ساتھ رہو۔

قرآن کی دوسری آیت ہے۔

وقل لعبادی یقول التی ھی احسن ان الشیطان ینز غ بینھم.

(اور میرے بندوں سے کہدو کہ وہ اچھی بات کہیں بے شک شیطان ان کے درمیان

جھگڑا پیدا کرنا چاہتا ہے)۔

شیطان اور اس کی اکساہٹ پرنفس اپنے دوستوں، ساتھیوں اور ملنے اور جاننے والوں کے بارے میں تھوڑی تھوڑی بات پر کدورت، نفرت، دوری، اشتعال اور جھنجھلاہٹ پیدا کردیتا ہے، شیطان تو وسوسہ ڈال دیتا ہے لیکن نفس اس شیطانی وسوسہ کو پال کر اسے طاقتور کردیتا ہے۔

صلح اور سلیقہ کے ساتھ رہنے کا ڈھنگ سیکھنا اس لئے بھی ضروری ہے، تاکہ نفسیات میں بگاڑ پیدا نہ ہو اور افراد کی توانائیاں ایک دوسرے کو زیر کرنے میں صرف نہ ہوں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی عزت میں اضافہ کرتا ہے جو دوسروں سے عفوودرگزر کا معاملہ کرتا ہے۔

دوسروں کی کوتاہیوں کو معاف کرنا ان سے ہر طرح کے حالات میں بہتر تعلقات استوار کرنا، یہ بہتر انسانی وصف ہے، جس سے دوسرے بہتر اوصاف بھی پیدا ہوتے ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ افراد سے کشیدگی پیدا کرنے اور تعلقات کی خرابی میں نفس کی شرارت کو زیادہ عمل دخل ہوتا ہے، نفس ہرصورت میں اپنی فضیلت چاہتا ہے، اس لئے وہ اپنے مزاج کے خلاف معمولی بات کو بھی بڑی بات بنا کر دوسروں سے الجھنا چاہتا ہے، اس معاملہ میں نفس کی شرارتوں کو سمجھنے کے لئے بہت زیادہ خود احتسابی کی ضرورت ہے، دوسری صورت میں فرد کی شخصیت اپنے وقار اور اپنی عزت کے نام پر دوسروں سے الجھاؤ اور ٹکراؤ کے راستے پر گامزن ہوکر معاشرے کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا موجب بننے لگتی ہے، اپنی شخصیت کے بت کو توڑنے کی ضرورت ہے، اسے توڑے بغیر احترام انسانیت کے سلیقہ سے بہرہ وری بہت مشکل کام ہے۔

(۶۷) معاشرہ میں سلیقہ انسانیت کی تحریک کو فروغ دینا، یہ آپ کی اور ہماری ذمہ داریوں میں شامل ہے، بلکہ ہمارے کاموں کی فہرست میں اس کام کو اولین ترجیح حاصل ہونی چاہئے، لیکن اس سلسلہ میں حساس اور فکرمندی ہونے کے باوجود ہم اگر کوئی کردار اور کرنے سے قاصر ہیں اور قیل وقال سے آگے بڑھنے کے لئے تیار نہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہم مادیت پرستی کی عالمگیر تحریک سے مرعوب ہیں اور اس جرأت رندانہ سے محروم ہیں، جو طاقتور

صاحب ایمان افراد کا خاصہ ہوتی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم ایمان ویقین کی اس حالت میں داخل ہوں، جہاں فرد مادیت پرستی کی قوتوں کے حصار سے باہر نکل آتا ہے۔ اور اللہ کی ذات پر یقین کی قوت اسے ہر طرح کے حالات میں حق کے فروغ کے لئے کام کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

جب تک فرد باطل کی داخلی قوتوں کو ایک حد تک شکست دے کر، اسے کمزور کرنے اور اللہ محبوب کی مرضیات کو اپنی شخصیت کا حصہ بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور جب تک اس کی لئے اپنی شخصیت پر وحدانیت کا رنگ غالب نہیں ہوتا، تب تک باطل سے معرکہ آرائی کے سلسلہ میں فرد کی قوت ارادی مستحکم نہیں ہوسکتی۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ معاشرہ میں بہت سارے افراد ہیں، جو بڑھتے ہوئے فساد کی روک تھام کے سلسلہ میں کردار ادا کرنا چاہتے ہیں، لیکن وہ اس سلسلہ میں پیش قدمی سے اس لئے قاصر ہیں کہ وہ سلیقہ انسانیت کی تحریک کو اپنی ذات پر لاگو کرنے اور صبغۃ اللہ کو اپنی شخصیت پر غالب کرنے پر آمادہ نہیں۔

یہ وہ تضاد ہے جو باصلاحیت اور ذہین افراد کو سلیقہ انسانیت کی تحریک کو فروغ دینے کے سلسلہ میں کوئی کردار ادا کرنے سے روکے ہوئے ہے۔

(۶۸) سلیقہ انسانیت سے بہرہ ور درویش آج بھی ہمیں اپنی سادہ زندگی، شان ومان، شہرت اور ونام نمود سے دوری کے ذریعہ زبانِ حال سے یہ پیام دے رہے ہیں کہ خواب غفلت سے بیدار ہوکر، راہ محبت میں داخل ہوں اور دل کے خزینوں تک رسائی حاصل کروتو دنیا جہاں سے بے نیاز کر دیئے جاؤگے، دل کے خزینوں تک رسائی کے بعد دنیا کے خزانوں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور ساری فکرمندی ابدی زندگی کے حوالے سے ہونے لگتی ہے اور دنیا میں روزی کا جو حصہ مقدر میں ہوتا ہے، وہ ہرصورت میں مل کر رہتا ہے۔

درویشوں کے اس پیام کو دل کے کانوں سے سننے کی ضرورت ہے، دوسری صورت میں دنیا کی دہشت، خوف زدہ کرکے فرد کی ساری توانائیوں کو دنیا کے حصول کی جدوجہد میں نچوڑ کر اس کی صلاحیتوں کو معطل کردے گی۔

خدا مست درویش ہمارے اڑوس پڑوس میں چھپے ہوئے موجود ہیں، وہ مادیت کے

طوفانوں کے خطرات کو بھانپ کر، خود کو اس طوفان کی امکانی لہروں سے بچانے کی خاطر زبان قال سے نہیں، بلکہ زبان حال سے ہمیں دعوت فکر دے رہے ہیں۔ ان کی سادگی، دنیا سے ان کی بے نیازی، ان کی کم گوئی، افراد کی اصلاح کے لئے ان کی حریصانہ ادائیں، فقر سے سرشار ان کی شخصیت ایسی ہے، جو ہمیں مادیت کا ایندھن بننے اور ورح اور دل پر ہر وقت گرنے والے انگاروں سے روکنے کے لئے بلارہی ہے، ان کی آواز ہمیں اس لئے نہیں سنائی دے رہی ہے کہ دنیا نے ہمیں مسحور کر دیا ہے اور ہم دنیا کے زیب وزینت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں، ہم ان درویشوں کو سادہ لوح، دنیا سے لاعلم بلکہ بے وقوف سمجھکر ان کے پیام کو مسترد کررہے ہیں، اس کی جو سزا ہم بھگت رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ مادیت کی آتش میں جل رہے ہیں، دنیا کے مسائل کی احساسِ سنگینی نے ہمارے لئے زندگی دوبھر کردی ہے۔ چند دنوں کے مستقبل کی فکر نے ہماری نیندیں حرام کردی ہیں۔ اشتعال وجھنجھلاہٹ کے مزاج نے ہماری شخصیت کو دوسروں کے لئے اذیت کا موجب بنا دیا ہے۔

اللہ سے محبت کے پیام کو دل کے کانوں سے نہ سننے کی ہمیں جو بھی سزا ملے وہ کم ہے۔ اس لئے کہ اللہ سے محبت فطرت کا ناگزیر حصہ ہے، فطرت سے بھاگ کر ہمیں کہیں بھی جائے پناہ نہیں مل سکتی، اس صورت میں ہمیں مادیت کی بے رحم موجوں کے تھپیروں ہی کا شکار ہونا پڑے گا۔

ہمیں اپنی حالت زار پر رحم کھاتے ہوئے درویشوں کو تلاش کرکے، اپنے دل کو محبوب حقیقی کی محبت سے گرم کرنا پڑے گا،ان کی صحبت سے اطاعت، عبادت اور ذکر وفکر کی راہ آسان ہونا شروع ہوگی اور یہی نجات کی راہ ہے۔

(۶۹) انسانی نفس کی قوت جسے اللہ ورسول کے مطیع کرنے یا نہ کرنے سے جنت وجہنم وابستہ ہے، نفسی قوت کی حقیقت اور اصلیت کے بارے میں کتنی ہی گفتگو کی جائے، لیکن اس گفتگو سے اس کی اصلیت کا معمولی حصہ بھی واضح نہیں ہوتا، آخر ایسا کیوں ہے کہ ہم خواہشات نفس اور اس کے اثرات ونتائج کے بارے میں بہت کچھ سنتے رہتے ہیں، لیکن اصلاح نفس کے سلسلہ میں ہماری پیش قدمی نہ ہونے کے برابر ہے اور نفس شناسی بلکہ صحیح الفاظ میں معرفت نفس کی ہماری صلاحیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا؟ دراصل اس کا سبب یہ ہے کہ نفس کی درندگی وحیوانیت کے فہم اور اس سے بچاؤ کی صورت کا تعلق ذکر وفکر کے مجاہدوں سے ہے، مجاہدوں کے بغیر محض گفتگو اور وعظ ونصیحت کی باتیں نفس پر چنداں اثر انداز نہیں ہوتی، اور مجاہدے ایسی چیز ہے، جس کا تعلق خواہشات نفس کو کچلنے کے لئے عملی جدوجہد سے ہے، اور یہ عملی جدوجہد ہی ہے جس کے لئے نفس تیار نہیں ہوتا اور اس راستہ میں وہ ہزار ہا رکاوٹیں لاکھڑی کردیتا ہے، مثلا مجاہدوں کے لئے وقت نہیں ہے، صحت اس کی متحمل نہیں ہے، معاشی مصروفیات اس کی اجازت ہی نہیں دیتی یا مجاہدے ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، اس طرح کی بہت ساری تاویلات ہیں، جو مجاہدوں سے بچنے کے سلسلہ میں نفس کھڑی کردیتا ہے۔

لیکن قرآن وسنت کے نصوص اور بزرگان دین کا سب سے زیادہ زور ذکروفکر کے مجاہدوں پر ہے، ”**واذکرواللہ کثیرا لعلکم تفلحون**“جیسی قرآن میں بیسیوں آیتیں موجود ہیں۔

چونکہ مجاہدوں کے بغیر نفس کی نہ تو اصلیت واضح ہوتی ہے اور نہ ہی نفسی قوتیں مفتوح ہوتی ہیں، سلیقہ انسانیت پیدا ہونا یا معرفت رب کا حاصل ہونا تو دور کی بات ہے۔

مجاہدوں سے ہی معرفت نفس اور معرفت رب کی راہ کھلتی ہے، مجاہدوں میں جتنی کمی ہوگی، اسی مناسبت سے نفسی قوتوں کی شہ زوری میں اضافہ ہوگا، اس لئے کہ نفس اللہ کے ذکر کے انوارحسن کے بغیر قابو میں نہیں آتا اور مادی حسن کے حوالے سے اس کی تشنگی میں کمی نہیں آتی۔

جن افراد نے اس نکتہ کو سمجھا، وہی مجاہدوں کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں، اور ایسے افراد ہی کے ساتھ اللہ کا وعدہ ہے۔ **والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا** (جو ہماری راہ میں مجاہدوں سے کام لیتے ہیں، ہم ان کو راستہ نکال کر دیتے ہیں)۔

گفتگو اس وقت مؤثر ہوتی ہے، جب فرد عملی طور پر مجاہدوں کی راہ اختیار کرتا ہے، اس وقت ہی مجاہدوں کے لئے اس طرح کی گفتگو سے ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے اور نفس کے خلاف معرکہ آرائی کے حوصلہ وہمت میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔

یاد رکھیں، کہ محض گفتگو سے چاشنی لیتے رہنا اور ذکر وفکر کے مجاہدوں کے لئے آمادگی کا نہ ہونا، اس سے فرد کی مجاہدوں کی صلاحیت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی ہے اور اللہ کے ذکر

کے حوالے سے بے حسی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، یہ بے حسی ہی **ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ** (جان لو کہ اللہ فرد اور اس کے قلب کے درمیاں حائل ہوجاتا ہے) کا موجب بن جاتی ہے۔

سو باتوں سے بہتر یہ ہے کہ فرد چندلمحوں کے لئے اندر میں غوطہ زن ہوکر باطنی قوتوں کو بیدار کرے، باطنی قوتوں کی بیداری ہی سے نفسی قوتوں پر فتحیابی کا عمل شروع ہوتا ہے۔

(۷۰) ہماری جدید نسلیں اس اعتبار سے قابل رحم ہیں کہ ان کے ذہن کی ساری نشوونما منفی بنیادوں پر ہورہی ہے، جب کہ مثبت سوچ سے ان کے ذہن آشنا ہی نہیں، ہر ذہین نوجوان مادی علوم ودنیاوی ترقی ومعلومات کے اعتبار سے تو تیز تر ہے، لیکن اپنی روحانی وباطنی صلاحیتوں کے فہم کے اعتبار سے وہ خالی ہے، منفی سوچ کے غلبہ کی وجہ سے ہماری نوجوان نسل کا جو حشر ہوا ہے وہ بہت المناک ہے، وہ جسمانی، روحانی اور ذہنی ونفسیاتی طور پر مریض بن چکا ہے، اس کی زندگی خیر وبرکت سے محروم ہوچکی ہے، وہ بڑوں کے ادب وآداب سے دور ہو چکا ہے، ان کی شخصیت میں منفی سوچ کے غلبہ کی وجہ سے فساد اتنا بھر چکا ہے کہ وہ اپنی دنیا وآخرت بنانے اور اپنی جسمانی وروحانی صحت کی بھلائی کی باتیں سننے سے قاصر ہو چکا ہے، وہ اپنے آپ کو عقل کل سمجھنے کا مریض بن چکا ہے، وہ اپنی بھلائی اور اپنے خیر کے فہم وادراک سے قاصر ہو چکا ہے، اپنی پاکیزہ تہذیب اور اقدار کے حوالے سے کوئی نصیحت اس پر کارگر نہیں ہورہی ہے۔

ہر گھر میں لگ بھگ ماتم کی فضا برپا ہے کہ اولاد نافرمان ہوگئی ہے، وہ کہا ماننے کے لئے تیار نہیں، نوجوان نسل کی پسندوناپسند کے معیار بدل گئے ہیں۔

اس صورتحال کی تبدیلی اور نوجوان نسل کو صحیح خطوط پر گامزن کرکے جسمانی، ذہنی اور روحانی طور پر مستحکم کرنے کے بظاہر سارے راستے مسدود ہوگئے ہیں۔

یہ سب مادیت پرستی کی عمومی فضا کا اثر اور اس کا نتیجہ ہے، جب معاشرہ میں وبائی امراض پھوٹتے ہیں تو اس کے اثرات سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا، یہی صورتحال مادہ پرستی کے ہمہ جہتی اثرات کی بھی ہے، ہمارا کام ہرصورت میں حکمت وبصیرت سے سمجھاتے رہنا ہے، اپنی ذمہ داری سے کسی صورت میں فرار اختیار کرنا نہیں، اللہ کے ذات سے کچھ بعید نہیں کہ وہ حالات میں تبدیلی پیدا کرے، اس لئے مایوسی کسی صورت میں صحیح نہیں، ہمارا تجربہ ہے کہ جو افراد حکمت سے اپنی اولاد کی صحیح خطوط پر تربیت کے لئے فکرمند وکوشاں ہیں، ان کے لئے اللہ کی طرف سے حالات کے سازگاری کی صورت پیدا ہوہی جاتی ہے۔

(۷۱) اس وقت انسانیت ایسے نظام حیات کی محتاج ہے جو اسے مادیت اورنفس پرستی کی شیطانی قوتوں سے نجات دلا سکے اور اس کے پیچیدہ نفسیاتی، روحانی، معاشی ومعاشرتی مسائل کوحل کر سکے، یہ نظام حیات اسلام ہی ہوسکتا ہے، دوسرے کسی نظام میں یہ صلاحیت سرے سے موجود ہی نہیں۔

اسلام جیسے پاکیزہ اور رحمتوں کے حامل نظام کی برکتوں سے انسانیت صحیح طور پر اسی وقت مستفیض ہوسکتی ہے، جب اسلام کا نظام حیات کسی مسلم ریاست میں پوری طرح نافذ ہو اور اس کی ہمہ جہتی نوعیت کی برکتوں کا ظہور ہو، جب تک یہ صورت پیدا نہیں ہوتی، تب تک پوری انسانیت کے ساتھ ساتھ خود مسلمان بھی عالمی سرمایہ دار کی جلائی ہوئی مادیت پرستی کی آگ میں جلتے رہیں گے اور مادی حسن پر فدائیت کی اداؤں سے ان گنت روحانی، نفسیاتی اور معاشرتی مسائل بلکہ بحرانوں سے دوچار ہوتے رہیں گے۔

عالمگیر یہودیت نے عالمی سرمایہ دار سے ملی بھگت کرکے، پوری دنیا کو سازشوں کے ایسے جال میں پھنسا دیا ہے کہ انسانیت کے لئے مادیت ونفس پرستی کی ہمہ گیر وہمہ جہتی فضا سے بلند ہو کر حق وصداقت کے پیغام کو سننے کی اس کی صلاحیت ہی مفقود ہوگئی ہے، ان حالات میں افغانستان اور ترکی دو ایسے مسلمان ممالک موجود ہیں، جن سے آنے والے دس سالوں میں یہ امید رکھی جا سکتی ہے کہ انشاء اللہ وہ عالمگیر باطل قوتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اسلام کے روحانی، معاشی، معاشرتی اور اجتماعی نظام کو ایک حد تک نافذ کرنے میں کامیاب ہوں گے، اس طرح انشاء اللہ دنیا ایک نئے پاکیزہ اور انسانی فطرت سے ہمہ آہنگ نظام کی برکتوں سے روشناس ہو سکے گی، اس طرح انسانیت کو یہ موقعہ مل سکے گا کہ وہ کسی جبر کے بغیر آزادانہ طور پر یہ فیصلہ کرسکے کہ وہ دنیا میں مادہ پرستی پر مبنی نظام کی جہنمی فضاؤں میں رہنا چاہتی ہے یا اسلامی فطرت سے ہمہ آہنگ اسلام کے بابرکت نظام میں۔

(۷۲) معاشرہ میں سلیقہ انسانیت کو فروغ دینے کے لئے یعنی دعوتی کام کے لئے جہاں جذبہ وتحرک کی ضرورت ہے، وہاں اس سے بھی زیادہ سلیقہ وحکمت ناگزیر ہے، اگر سلیقہ

وحکمت موجودنہیں تو جذبہ وتحرک سے بہتر منصوبہ بندی تو ہوسکتی ہے، لیکن عملی طور پر کام کے سلسلہ میں زیادہ پیش قدمی نہیں ہوسکتی۔

سلیقہ کا تعلق دل کی صلاحیتوں کی بیداری سے ہے، اسی سے حکمت، بصیرت وفراست پیدا ہوتی ہے اور دل پروہ باتیں اور وہ نکات القا ہوتے ہیں، جس سے فرد اپنے حصہ کے دعوتی کام کے سلسلہ میں مؤثر کردار ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے، اور اس کے کام میں برکت بھی شامل ہوتی ہے، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ذہین وباصلاحیت افراد کی طرف سے دعوتی کام کے لئے پلاننگ تو بہتر ہوتی ہے، وسائل کی صورت بھی کسی حد تک پیدا ہوجاتی ہے، لیکن صحیح سمت میں کام کے دروازے کم ہی کھلنے پاتے ہیں اس طرح فرد وافراد عام طور پر ساری زندگی قیل وقال اورنشتند وبرخاستند میں گزار لیتا ہے۔

کام کے سلسلہ میں بہتر حکمت عملی کا تعلق چونکہ دل کی صلاحیتوں کی بیداری سے ہوتا ہے اور جدید افراد دل کی صلاحیتوں کی بیداری کے کام کو زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیارنہیں ہوتے، اس لئے اس سلسلہ میں ان کی ساری تگ ودو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتی، معاشرے کی اصلاح تو دور کی بات ہے، ان کی اپنی زندگی اصلاح کے حوالے سے تشنہ طلب رہتی ہے اور وہ یہ نکتہ سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ ایسا کیوں ہورہا ہے، ان کی نشتیں، ان کی قیل وقال اورمنصوبہ بندی نتائج سے خالی کیوں ہوتی ہے، اس کے اثرات ان کی اپنی ذاتی زندگی اور معاشرے پر کیوں نہیں پڑتے۔

دراصل یہ سب نتیجہ ہوتا ہے محض عقلی صلاحیتوں سے کام لینے اور روحانی صلاحیتوں کی عدم بیداری کا۔

(۷۳) انسانی تخلیق میں رحمانی وملکوتی قوتوں کے ساتھ ساتھ سفلی اور مادی قوتیں بھی پوری طرح شامل ہیں، رحمانی وملکوتی قوتوں کا روح اور دل سے گہرا تعلق ہے، جب کہ سفلی قوتوں کا تعلق نفس، شیطان اور مادی قوتوں سے ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کو ہر وقت اپنے مولا سے تعلق کو مستحکم کرنے کے لئے روحانی اور وجدانی صلاحیتوں سے کام لیتے رہنے کی سخت ضرورت ہے، دوسری صورت میں سفلی، شیطانی اور مادی قوتیں اس پر غالب ہوکر شخصیت میں فساد برپا کرنے، اس کی داخلی زندگی کو درہم برہم کرنے اور اس پر مادی قوتوں کو غالب کرنے میں کامیاب ہوں گی۔

اللہ کی معیت اس کی دستگیری ورہنمائی اور اس کا استحضار انسانی شخصیت کی سب سے ناگزیر ضرورت ہے، انسانی شخصیت اور معاشرے میں ہمیشہ سے جو بحراں موجود رہا ہے، اس کا بنیادی سبب ہی یہی رہا ہے کہ افراد اپنے خالق سے تعلق کی نوعیت کو سمجھنے اور اس تعلق کو مستحکم کرنے سے اعراض (دوری) کی روش پر گامزن رہے ہیں، موجودہ دور میں بھی سلیقہ انسانیت کے پیدا شدہ سارے بحران کا سبب یہی ہے۔

اپنے خالق کو فراموش کرنے کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ فرد داخلی نوعیت کے سنگین تضادات کا شکار ہوجاتا ہے کہ دل، روح اورنفسی قوتوں کے درمیاں شدید کشمکش شروع ہوجاتی ہے، بلکہ خارجی زندگی یعنی اجتماعی ومعاشرتی زندگی میں بھی درندگی، شیطنت اور مادی قوتوں کو ہرطرح فساد برپا کرنے کا موقعہ ملتا ہے، اس طرح انسانی زندگی تباہی کا منظر پیش کرنے لگتی ہے۔

اپنے مولا سے تعلق وعدم تعلق کے نتائج کے موضوع پر ایک اہل اللہ نے بہت عمدہ بحث کی ہے، ان کی اس بحث کی اہمیت کے پیش نظر ہم یہاں اسے پیش کررہے ہیں۔

’’ اے غافل انسان! تمہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ ’’اللہ‘‘ کا یہ پاکیزہ اور مبارک لفظ جس طرح اسلام کا ایک شعار ہے، اسی طرح یہ وہ برگزیدہ لفظ ہے، جس کا ذکر تمام موجودات زبانِ حال سے کررہی ہیں۔

پس اے عزیز من! اگر تیری یہ خواہش ہے کہ تجھے اس میں پائے جانے والی دائمی اور عظیم الشان قوت اور نہ ختم ہونے والی وسیع وعریض برکات کا ادراک ہوجائے تو اس چھوٹی سی تمثیلی کہانی کوغور سے سنو :

ایک بدوی، جس کا صحرا میں پھرنا پھرانا اور آنا جانا رہتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی قبیلے کے سردار کے ساتھ راہ ورسم رکھے اور اس کی حمایت اور حفاظت میں رہے، تاکہ لٹیروں کی دستبرد سے محفوظ رہ کر، اپنے کام سرانجام دے سکے اور اپنی حاجات وضروریات

کی تکمیل کرسکے، بصورت دیگر وہ بے شمار دشمنوں کے سامنے تنہا، حیرت زدہ، بے چین اور پریشان حال رہ جائے گا، کیونکہ اس کی حاجات وضروریات جو کہ بے حد وحساب ہیں، اس طرح کی بے پروائی سے پوری نہیں ہو پائیں گی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو آدمی اس قسم کی سیاحت کے لئے گھر سے نکلے، ان میں سے ایک آدمی عاجز اور متواضع اور دوسرا خود سر اور مغرور تھا، عاجز اور متواضع آدمی اپنا تعلق ایک سردار کے ساتھ جوڑ کر، اس کی ماتحتی میں آ گیا اور اس کا پیروکار بن گیا۔ جبکہ مغرور آدمی نے کسی کے ساتھ اس قسم کا تعلق جوڑنے سے انکار کردیا۔ سردار کے ساتھ تعلق رکھنے والا آدمی جس خیمے میں جاتا، سردار کی تعلق داری کی وجہ سے ہر کوئی اس کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آتا، اور اگر راستے میں اسے کوئی لٹیرا مل جاتا تو وہ اسے کہتا: ''میں یہاں علاقے کے سردار کا آدمی ہوں اور اسی کے تعارف اور مہربانی سے یہاں گھوم پھر رہا ہوں۔'' اس پر وہ لٹیرا اس کا راستہ چھوڑ دیتا، جبکہ خودسر اور مغرور آدمی کو اس قدر مصائب وآلام کا سامنا کرنا پڑا، جو بیان سے باہر ہیں، کیونکہ وہ اپنے تمام سفر میں مستقل خوف وہراس اور مسلسل خطرات سے دوچار رہا، اور یوں اس نے اپنے آپ کو خود ہی ذلیل کر لیا۔

پس اے غافل ومغرور انسان!

یاد رکھو: کہ تم ہی وہ سیروگردش کرنے والے بدوی ہو، اور یہ وسیع وعریض دنیا وہ صحرا ہے، جس میں تم گھوم پھر رہے ہو۔ تمہارے ''فقر وعجز'' کی کوئی حد نہیں ہے۔ اسی طرح تمہارے دشمنوں کی اور تمہاری حاجات وضروریات کی بھی کوئی حد نہیں ہے تو جب حالت یہ ہے، تو پھر اس صحرا کے حقیقی مالک اور ابدی حاکم کی پناہ میں آجاؤ، اس طرح تم دنیا کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور مصائب وحادثات کے سامنے خوف وخطر کی ذلت سے بچے رہوگے۔

جی ہاں! یہ، ''اللہ'' کا اسم نام اتنا بڑا خزانہ ہے، جو کبھی فنا نہیں ہوگا، اس پاکیزہ نام کے ذریعے تمہارا ''عجز'' کائنات سے بھی وسیع اور بے پایاں رحمت کے ساتھ منسلک ہوجائے گا، اور اس کی برکت سے تمہارا ''فقر'' اور تمہاری درماندگی اس عظیم اور بے پایاں قدرت کے ساتھ منسلک ہوجائے گی، جس نے ذرات سے لیکر کہکشاؤں تک تمام کائنات کو سنبھالا ہوا ہے، حتیٰ کہ تمہارا ''عجز'' اور تمہارا ''فقر'' دونوں اس رب رحیم وذوالجلال والاکرام کے حضور تمہارے سفارشی بن جائیں گے۔ اور ان کی سفارش قبول بھی ہوگی۔

بے شک جو شخص ''اللہ'' کے ساتھ حرکت کرتا ہے، اس کی مثال ایسے ہے، جیسے کوئی شخص فوج میں بھرتی ہوجائے، اب وہ گورنمنٹ کے نام سے ہر قسم کا تصرف کرتا ہے اور کسی سے خوف نہیں کھاتا ہے، وہ ''قانون'' اور حکومت کا ترجمان بن جاتا ہے، اس طرح وہ اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتا ہے اور ہر چیز کے سامنے ثابت قدم رہتا ہے۔

پس ''اللہ'' ابتدا کے لحاظ سے ذکر ہے اور ''الحمدللہ'' انتہا کے لحاظ سے ''شکر'' ہے، اور جو چیز ان دونوں کے درمیاں میں ہے، وہ ''فکر'' ہے۔ یعنی ان انوکھی نعمتوں کے بارے میں غور وفکر کرنا اور اس بات کا ادراک کرنا کہ یہ نعمتیں اس ذات کا معجزہ اور اس کی بے پایاں رحمت کے تحفے ہیں، جو احد اور صمد یعنی یگانہ، یکتا اور بے نیاز ہے۔ بس اس سوچ کا نام ہی ''فکر'' ہے۔

تو کیا وہ آدمی، جو اس سپاہی کے قدم چومتا ہے، جو ایک خادم کی حیثیت سے بادشاہ کی طرف سے اسے کوئی قیمتی تحفہ پیش کرتا ہے، کیا وہ آدمی بدترین حماقت اور معیوب قسم کی بیوقوفی کا مظاہرہ نہیں کررہا ہے؟ اگر ایسا ہے۔ اور واقعتاً ایسا ہی ہے۔ تو پھر اس آدمی کے بارے میں کیا خیال ہے جو ان مادی اسباب کی تعریف میں مگن رہے، جو بظاہر اسے نعمتیں دے رہے ہیں؟ اور انہی اسباب کو حقیقی پیار، محبت اور دلبستگی کا مرکز بنالے اور منعم حقیقی کو یکسر بھول ہی جائے؟ کیا یہ آدمی اس سپاہی سے ہزار گنا زیادہ بیوقوف نہیں ہے؟

پس اے میرے عزیز! اگر تم اس احمق اور بیوقوف کی طرح نہیں ہونا چاہتے ہو تو پھر:

دو، اللہ کے نام سے۔

لو، اللہ کے نام سے۔

شروع کرو، اللہ کے نام سے۔

کام سر انجام دو، اللہ کے نام سے۔“

(۷۴) انسان کو دنیا میں آزمائش کی جس بھٹی میں ڈالا گیا ہے، اس کا تعلق خیال کی قوت سے ہے۔ خیال کی قوت کا رخ اگر مادیت اور خواہشات کی طرف ہے، یعنی اگر خیالی قوت کا مرکز مادی خواہشات ہیں تو انسان سراسر خسارہ میں ہے، لیکن اگر خیال کی قوت میں مثبت اور صحتمند پہلو غالب ہے تو یہ خیالی قوت نفسی قوتوں کو صحتمند بنیادوں پر تبدیل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوگی، اس طرح یہ خیالی قوت نفس کو مہذب بنانے اور فرد کو دنیا وآخرت میں فوز وفلاح سے بہرہ ور کرنے میں کامیاب ہوگی۔

خیالی قوت کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ شروع میں بھٹکتی رہتی ہے اور وسوسوں کا ہجوم رہنے لگتا ہے اور یہ قوت ایک مرکزی نکتہ پر آنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہوتی، اس لئے کہ نفسی قوت اور خواہشات نفس کا درندہ خیالی قوت کے پس پردہ موجود ہوتا ہے، وہ خیالی قوت کی پاکیزہ خطوط پر تشکیل کی راہ میں سخت حائل ہوتا ہے، خیالی قوت کو پاکیزہ مرکزی نکتہ پر لانے کے لئے نفس کے ساتھ عرصہ تک معرکہ آرائی کرنی پڑتی ہے، اس سلسلہ میں ذہن کی غیر معمولی طور پر ارتکازی قوت سے کام لینا پڑتا ہے۔

ایک بار خیال کی قوت کو پاکیزہ خطوط پر ڈالنے کے بعد خیال کی اس قوت کی مستقل طور پر نگہداشت اور حفاظت سے کام لینا پڑتا ہے، اور غیر معمولی قوت ارادی سے کام لینا پڑتا ہے، رفتہ رفتہ منفی خیالی قوت سے مقابلہ کرنا آسان ہونے لگتا ہے اور پاکیزہ سوچ اپنی جگہ بنا لینا شروع کردیتی ہے، پاکیزہ سوچ رحمانی وملکوتی قوتوں کو بھی اپنے ہمراہ لاتی ہے، اس طرح منفی سوچ سے مقابلہ کرتے ہوئے جہاں صحتمند اور پاکیزہ خیالی قوت فرد کے مزاج کا حصہ بننے لگتی ہے، وہاں فرد کو حلاوت سے سرشار ایک نئی زندگی بھی عطا ہوتی ہے، جس میں سلیقہ انسانیت کے سارے اجزاء موجود ہوتے ہیں۔

بس ضرورت اس بات کی ہے کہ منفی خیالی قوت سے مقابلہ کے دوران فرد ہمت وحوصلہ سے کام لیتا رہے اور جب تک پاکیزہ خیالی قوت، منفی خیالی قوت پر بڑی حد تک غالب نہیں آتی، تب تک وہ حوصلہ وہمت سے کام لیتے ہوئے اس راہ پر چلتا رہے اور سارے نشیب وفراز اور مدوجزر اسے پاکیزہ خیالی قوت سے روکنے میں ناکام ثابت ہوں، اس حوصلہ سے ہی منفی خیالی قوت کے پس پشت موجود نفسی قوتوں کو شکست دی جا سکتی ہے۔

(۷۵) انسانیت اس وقت جس بحران سے دوچار ہے، وہ بحران خیالی قوت کو مادی اور نفسانی رخ دینے کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوا ہے اور سنگین ہوا ہے، یہ خیالی قوت ہی ہے، جو سوئے ہوئے نفسی درندہ کو مشتعل کرتی ہے، اور اسے مادی حسن پر فریفتہ کرکے اسی جدوجہد پر اکساتی ہے، خیالی قوت چوبیس گھنٹے مسلسل کام میں مصروف رہتی ہے، اگر یہ خیالی قوت مثبت اور صحتمند اجزاء سے بالکل خالی ہو تو چوبیس گھنٹے مسلسل کام کے نتیجہ میں یہ خیالی قوت فرد کی حیوانی مادی قوت کو جتنا طاقتور بنا سکتی ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، ہمارا موجودہ معاشرہ اسی خیالی قوت کے غلبہ کی غمازی کررہا ہے کہ سنگ دلی وقساوت قلبی بڑھ گئی ہے، انسانیت نوازی کی سوچ ہی مفقود ہوگئی ہے اور انسان عام طور پر حیوانیت کا نمونہ بن گیا ہے، خیالی قوت کو مکمل طور پر منفی قوتوں میں تبدیل کرنے کا نتیجہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا برآمد ہی نہیں ہوسکتا۔

(۷۶) انسانی شخصیت کی تخلیق میں شر اور خیر کی دونوں قوتیں کارفرما ہیں، اس لئے ان دونوں قوتوں کے درمیاں خیالی قوت کے ذریعہ کشمکش اور تصادم کی صورت موجود رہتی ہے، خیر کی قوتیں خیالی قوت کو خیر کی راہ پر لے جانا چاہتی ہیں، جب کہ شر کی قوتیں خیالی قوت پر مادی حسن اور دنیا کی زیب وزینت کے نقش کو مستحکم کرنا چاہتی ہیں، یہ کشمکش ایسی ہے، جو افراد کے ساتھ عام طور پر برسوں تک جاری رہتی ہے اور بیک وقت دونوں خیالات کی لہریں ساتھ چلنا شروع کردیتی ہیں، کبھی فاسد خیالات کی لہر حاوی ہونے لگتی ہے تو کبھی پاکیزہ خیالات کی لہریں، لیکن جلد ہی مادیت پرستی پر مشتمل ماحول کے غلبہ کے اثرات کی وجہ سے خیر کی خیالی قوت کمزور ہوکر بالکل مدھم ہوجاتی ہے اور فاسد خیالات پوری طرح حاوی ہونے لگتے ہیں اور منفی خیالی قوت پوری انسانی شخصیت کا احاطہ کرلیتی ہیں۔

فرد جب اس حالت پر پہنچ جاتا ہے تو پھر صم بکم عمی کی صورت ہوجاتی ہے، تو فرد خیر کی باتیں سننے کا روادار ہی نہیں ہوتا۔

(۷۷) مذکورہ نکتہ کی مزید توضیح کی ضرورت ہے، خیالی قوت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فرد شروع میں اسے جس راہ پر لگانا چاہے، یہ خیالی قوت اس راہ پر

بغیر زیادہ مزاحمت کے لگنا شروع ہوجاتی ہے، اگر مثبت اور صحتمند خطوط پر خیالی قوت کا سفر شروع ہوا تو یہ صحتمند خطوط رفتہ رفتہ اتنے توانا ہوجائیں گے کہ نہ صرف خیالات میں پاکیزگی پیدا ہوجائے گی، بلکہ خیالی قوت کا یہ ارتکاز اپنے ساتھ روحانی ووجدانی قوتوں اور فطرت سلیمہ کی گہرائیوں کو بھی ہمراہ لائے گی، جس سے فرد وافراد کے سارے جذباتِ حسن کی تسکین کی صورت پیدا ہوگی اور یہ دنیا جنت کا منظر بن جائے گی۔ لیکن اگر شروع سے خیالی قوت کو منفی رخ پر ڈالا گیا تو اس کی بہت بڑی قیمت جو دینا پڑے گی، وہ یہ ہے کہ دل اور روح کا اضطراب بہت زیادہ بڑھ جائے گا اور ساری دنیا کی دولت اور خوشیوں کا سارا سامان موجود ہونے کے باوجود فرد ذہنی، نفسیاتی، اعصابی اور روحانی امراض کا مجموعہ بن کر رہ جائے گا، اور زندگی بھر جسمانی اور نفسیاتی صحت کے ساتھ ساتھ سکونِ قلبی کے لئے ترستا رہے گا، اس لئے کہ فاسد خیالات اندر میں موجود فاسد مادی قوتوں کو فروغ دینے اور شیطانی قوتوں کی معیت میں زندگی کا سفر شروع کرنے کا باعث بنتا ہے۔

فاسد خیالی قوت کے غلبہ کا لازمی نتیجہ دل، روح اور فطرت سلیمہ کے اجزاء کی بربادی اور مادی، حیوانی، جبلی اور شیطنت کی قوتوں کی ہمراہی کی صورت میں ہی ظاہر ہوتا ہے، جس کا نتیجہ انسانی جوہروں کی تباہی ہوتا ہے۔

اس وقت انسانیت مادی خیالی قوت کے غلبہ کی وجہ سے ہولناک فکری بحران سے دوچار ہے اور ساری انسانی شخصیت داخلی طور پر موت کا منظر پیش کررہی ہے، یہ سب خیالی قوت کو فساد سے بھرنے ہی کا نتیجہ ہے۔

(۷۸) انسانی نفس کی تہذیب اور تزکیہ کے کام کی مشکلات کو سمجھنا ضروری ہے، اس کے لئے سب سے عبرت انگیز حالات بنی اسرائیل کے ہیں، ان کی تاریخ کے مطالعہ سے انسانی نفس کی ہولناکی اور قہرناکی پوری طرح واضح ہوکر سامنے آتی ہے۔

بنی اسرائیل کی اصلاح وتربیت کے لئے لگ بھگ چار ہزار انبیاء کرام مبعوث ہوئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی ان کی تعلیم وتربیت کے کام کے لئے متعین ہوئے، فرعون اور فرعونیوں کی غرق یابی کا منظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، لیکن اس منظر کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ان کے ایک مؤثر گروہ نے بچھڑے کو معبود بنا کر اس کی پوجا کرنا شروع کردی۔

قرآن مجید یہود کی نفس پرستی کے جن مظاہر کا ذکر کرتا ہے، ان میں درج ذیل چیزیں شامل ہیں۔

انبیاء کرام، کی تکذیب کرنا، ان سے تمسخر کرنا، ان کی توہین کرنا، یہاں تک کہ خواہشات نفس کی راہ میں انہیں رکاوٹ سمجھکر، انہیں قتل تک کرنا، حسد کا مظاہرہ کرنا، لوگوں کا ناجائز مال کھانے کی روش کا ہونا، دنیا کی زندگی پر فریفتہ ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جہاد وقتال کے جواب میں یہ کہنا کہ تم اور تمہارا خدا جاکر لڑے ہم تو یہاں سے ٹلنے والے نہیں، بچھڑے کی پوجا کرنا، اللہ کے نبی کے فرمان مطابق گائے کو ذبح کرنے سے لیت ولال سے کام لینا، سودی کاروبار کرنا، اللہ سے گستاخی کے معاملہ میں اس حد تک پہنچنا کہ یہ کہنا کہ جب تک ہم اللہ کو نہیں دیکھیں گے تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کی اپنی اولاد سے بھی زیادہ معرفت کے باوجود آپ سے دشمنی کے معاملہ میں انتہا پر جانا، مشرکین مکہ سے معاہدہ کرنا اور ان کے بتوں کی پرستش کے کام کو رسول اللہ ﷺ کی توحید کی تعلیمات سے زیادہ بہتر سمجھنے کی روش کا ہونا، فرعون اور فرعونیوں کو غرق ہوتے ہوتے دیکھنے کے باوجود عبرت حاصل نہ کرنا، تزکیہ اور تربیت کی خاطر جنگل یا پہاڑی علاقہ میں من وسلویٰ کی غذا سے اکتا کر گیہوں اور پیاز جیسی عام چیزوں کا مطالبہ کرنا، اس کی وجہ سے چالیس سال تک پہاڑی علاقہ میں حیران وسرگرداں ہونا۔

اللہ کی نافرمانیوں کی بنا پر دوبار بادشاہوں کی طرف سے ان کی اینٹ سے اینٹ بجانا اور عبرتناک سزا کا ملنا، اللہ کی کتاب تورات میں خصیص مال کی خاطر تحریف کرنا اور کتاب کی تعلیم کو معمولی قیمت میں فروخت کرنے کی روش کا ہونا، وغیرہ وغیرہ۔

بنی اسرائیل کا یہ اجتماعی کردار ایسا ہے، جو دراصل نفسی قوتوں کی بہیمانہ ’’خصوصیات‘‘ کا اظہار واعلان ہے، اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ غلط ماحول میں عادتوں کے استحکام کے بعد تزکیہ وتربیت کا کام مشکل ترین ہوتا ہے، اس صورت میں افراد اللہ کے دوستوں کی راہ زنی کرنے، ان کی آخری حد تک مخالفت کرنے اور ان سے مقابلہ کرنے سے باز نہیں آسکتے۔

امام ابن جوزی نے اپنی کتاب ''تلبیس ابلیس'' میں یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک بار اہل کتاب کے مدرسہ میں گئے، آپ نے مفتی صاحب سے فرمایا کہ میں آپ سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں، وہ آپ کے ساتھ آئے، آپ نے ان سے فرمایا کہ میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ یہ بتاؤ کہ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ میں اللہ کا رسول نہیں ہوں، مفتی صاحب نے کہا کہ یا رسول اللہ، میں اور میری قوم حقیقۃً یہ سمجھتی ہے کہ آپ اللہ کے وہی رسول ہیں، جس کا ذکر ہماری کتابوں میں ہے، لیکن میری قوم آپ پر ایمان نہیں لائے گی، آپ نے فرمایا، اس کا سبب؟ مفتی صاحب نے کہا کہ میری قوم کو دوسروں قوموں پر جو فضیلت وفوقیت حاصل ہے، آپ پر ایمان لانے سے وہ اپنی اس حیثیت کو کیسے ختم کرے گی، آپ ﷺ نے مفتی صاحب سے پوچھا، تمہارے ایمان نہ لانے کا سبب؟ مفتی صاحب نے کہا کہ مجھے اپنی قوم پر جو فضیلت وبرتری حاصل ہے، آپ پر ایمان لاکر میں اسے کیسے ختم کر سکتا ہوں۔

ابن جوزی کی اس روایت کا یہاں مفہوم پیش کیا گیا ہے۔

اہل کتاب کی یہ نفسیات، انسانیت کے اس المیہ کا اظہار ہے کہ مفادات اور برتری وفوقیت کی نفسیات، انسان میں ہر دور میں اتنی پختہ رہی ہے کہ اس سے بلند ہوکر اس کے لئے سوچنا اور حق وصداقت کو صدق دلی سے قبول کرنا، اس کے لئے سب سے زیادہ دشوار رہا ہے۔

آج ہم بھی انسانی نفسیات کے اسی ابتلا وآزمائش سے دوچار ہیں کہ ایک طرف تو مادیت اور نفسانیت کی تیز تر لہریں ہیں، دوسری طرف مخلصانہ طور پر اللہ ورسول کی اطاعت اور مادیت سے بلند ہوکر آخرت کی تیاری کی فکر کی دعوت ہے، ان دونوں دعوتوں کے سلسلہ میں ہماری جو روش ہے، ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کیا ہماری یہ روش کہیں، اہل کتاب کی روش سے مناسبت ومشابہت تو نہیں رکھتی۔

(۷۹) سلیقہ انسانیت کے لئے مجاہدے ضروری ہیں، اس کے بغیر سلیقہ انسانیت سے بہرہ وری نہیں ہوسکتی، یہ مجاہدے اگر اہل تصوف کے ہوں جو اللہ اور لا الہ الا اللہ کے کثرت ذکر پر مبنی ہوتے ہیں تو زیادہ بہتر ہے، لیکن اہل تصوف سے باہر کے مجاہدے مسنون اذکار پر محنت، قرآن سے محبت کا تعلق، نوافل کا خصوصی اہتمام، مسلسل خود احتسابی سے کام لیتے رہنا، وغیرہ یہ مجاہدے بھی ایسے ہیں، جو اللہ سے محبت پیدا کرنے اور اخلاق حسنہ کا موجب بنتے ہیں، مجاہدوں کی یہ خاصیت ہے کہ اس سے نفسی قوتیں پامال ہوتی ہیں، آج کل حقیقی اہل اللہ کی تلاش مشکل ہوگئی ہے، بزرگی کے نام پر دکانداری کی روش غالب ہے، پھر بزرگوں کے ہاں بالعموم مجاہدے بھی ختم ہوگئے ہیں، پندرہ بیس منٹ کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے، پندرہ بیس منٹ کا ذکر مجاہدوں میں شامل نہیں، اس لئے کہ اس سے نفس کی حیوانی قوت میں کوئی خاص تغیر برپا نہیں ہوتا، اس لئے مجاہدے جس نوعیت کے بھی ہوں، اہل تصوف کے مجاہدے ہوں یا ان سے باہر مسنون اورادو اور قرآن سے تعلق اور نوافل کے مجاہدے، یہ سارے مجاہدے نفس کو مہذب بنانے میں مؤثر ہیں، البتہ ان مجاہدوں کے ساتھ صالحین کی صحبت کا اہتمام ضروری ہے، یعنی فرد کو نیک لوگوں کے صحبت کے ماحول کو اپنے لئے حصار کی حیثیت سے اختیار کرنا چاہئے۔

ذکر وفکر کے مجاہدے اور نیک افراد کی صحبت، یہ دونوں چیزیں مل کر فرد کی زندگی میں مستحکم بنیادوں پر تغیر وتبدل پیدا کرنا شروع کردیتے ہیں اور مادیت کے تھپیروں سے بچا کر، اللہ کی راہ پر گامزن کردیتے ہیں، اللہ سے محبت، اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت اور اللہ کے بندوں سے بہتر تعلقات اور اخلاق حسنہ یہ ساری چیزیں مجاہدات کی خصوصیات میں شامل ہیں، اگر کردار میں بہتری وپاکیزگی پیدا ہونا شروع ہوئی ہے، دنیا سے سردمہری کی فضا پیدا ہوئی ہے تو سمجھا جائے گا کہ مجاہدوں نے نفس کی قوت کو پامال کرکے، اسے لوامہ سے مطمئنہ کے مرحلہ میں داخل کردیا ہے، لیکن اگر دولت، دنیا، اہل دنیا اور راحت کے سامان سے وابستگی اور تعلق خاطر موجود ہے، اور اہل دنیا کی طرح دولت اور سامان راحت کی حسرت شہرت وناموری کی خواہش موجود ہے اور اس کے لئے کوشش بھی تو سمجھا جائے گا کہ ابھی مجاہدے اس مقام پر نہیں پہنچے، جہاں اس کے پاکیزہ ثمرات اور خصوصیات ظاہر ہوں، ابھی طالب کو ہمت اور مستعدی سے مجاہدوں کی راہ پر چلنا پڑے گا۔

(۸۰) موجودہ دور میں بزرگی کے نام پر شیخ العرب والعجم، قطب الاقطاب، اور شیخ المشائخ جیسے القاب عام ہیں، یہ القاب حقیقی اہل اللہ کے پیام اور اس کی روح کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہیں، حقیقی تصوف تو فنائیت اور اپنی شخصیت کو آخری حد تک مٹانے کا سبق دیتا ہے اور باقاعدہ سلوک طے ہونے کے بعد عاشق حقیقۃ اللہ کی شان عظمت کے غلبہ کے تحت اللہ کے بندوں میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ سیاہ کار اور حقیر سمجھنے لگتا ہے

اور یہ نفسیات اس پر اتنی غالب آ جاتی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے ساتھ اس طرح کے القاب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اس طرح کے القابات پر خاموشی اختیار کرنا بجائے خود رضامندی کی علامت ہے اور اس پر خوشی محسوس کرنا، یہ تو اللہ کی طرف سے ابتلا وآزمائش کی علامت ہے، ایسے افراد کو جو اپنے مریدوں کے ذریعہ اپنے لئے اس طرح کے القاب استعمال کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، اس کی عام طور پر سزا یہ ملتی ہے کہ انہیں اہل دنیا کے حوالے کر دیا جاتا ہے، ان کے لئے شہرت اور دولت کے راستے کھول دیئے جاتے ہیں، یہ شہرت اور دولت بالآخر ان کے حلقہ کی ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا ذریعہ بنتی ہے۔

اس طرح کے القابات کا ایک بڑا نقصان جو ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ سنجیدہ علمی حلقوں کے لئے اس طرح تصوف کے راستے مسدود ہوجاتے ہیں، دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسانی طبیعتیں عام طور پر اس طرح کے القابات کو ہضم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔

اگر حسن ظن سے کام لیا جائے اور یہ کہا جائے کہ حکمت عملی کی خاطر یہ القابات استعمال کئے جاتے ہیں تو یہ حکمت عملی بھی صحیح نہیں، احادیث میں خودثنائی (وہ چاہئے کتنی ہی بہتر حکمت عملی سے اختیار کی جائے) اس کی سختی سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔

(۸۱) اسلامی سیاست کا بنیادی اصول تقویٰ ونیکی کو فروغ دینا، اور افراد کی روحانی بالیدگی میں اضافہ کرنا ہے، تاکہ ایک طرف تو بندوں کا اپنے مولا سے تعلق مستحکم سے مستحکم تر ہو تو دوسری طرف اللہ کے بندوں سے اس کے محبت، شفقت ورحم کے تعلقات استوار ہوں، اس طرح اسلامی سیاست افراد کی روحانی وپاکیزہ اخلاقی صلاحیتوں کو جلادینے کا سبب بنتی ہے، جب کہ موجودہ دور کی جمہوری سیاست افراد کی روحانی بالیدگی، وسیع باطنی دنیا کی خوشی ومسرت اور افراد کے محبت وشفقت پر مبنی باہمی تعلقات سے سرے سے کوئی بحث ہی نہیں کرتی، اس کا سارا زور مادی ترقی وخوشحالی کی باتوں پر ہوتا ہے۔

یہ موجودہ دور کی سیکولر سیاست کا سب سے بڑا المیہ ہے، جمہوری سیاست کی جماعتیں وہ چاہے دینی جماعتیں ہوں یا خالص سیاسی نوعیت کی جماعتیں، ان میں کوئی جماعت بھی افراد کے محبت کے پاکیزہ جذبات کو فروغ دینے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی۔

جب کہ اسلامی سیاست کا بنیادی اصول ہی یہی ہے، اسلامی سیاست میں مادی خوشحالی کا تصور روحانی خوشحالی سے ہی وابستہ ہوتا ہے اس سے جداگانہ نہیں ہوتا۔

ریاست مدینہ یا خلافت کا نظام دراصل اعلیٰ درجہ کی تقوی اور مثالی باطنی وروحانی حالات اور تزکیہ ہی کا نتیجہ اور اس کا ثمرہ تھا۔ اسلامی سیاست کی یہی وہ بنیاد ہے، جس سے معاشرہ اسلامی سیاست سے ہمہ آہنگ ہوتا ہے، لوگ اپنے دکھ درد میں باہم شریک ہوتے ہیں، معاشی طور پر گرے ہوئے افراد کو اوپر اٹھالیا جاتا ہے۔

اسلامی سیاست میں معاشی طور پر ایک دوسرے کو گرانے کی کوششیں مفقود ہوتی ہیں، بلکہ اسلامی سیاست اللہ کے رسول کی اس حدیث کا نمونہ ہوتی ہے کہ تم میں سے کوئی شخص کامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے لئے جو کچھ چاہے وہی کچھ اپنے دوسرے بھائیوں کے لئے نہ چاہئے۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ایمان والوں کی آپس کی محبت، رحم دلی اور شفقت کی مثال ایک انسانی جسم جیسی ہے کہ اگر جسم کا کوئی حصہ تکلیف میں مبتلا ہوجاتا ہے تو (وہ تکلیف صرف اسی حصہ میں منحصر نہیں رہتی بلکہ اس سے) پورا جسم متاثر ہوتا ہے اور پورا جسم جاگتا ہے اور بخار وبے خوابی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ (بخاری شریف)

سیاست سے وابستہ جن افراد میں یہ خصوصیات موجود ہوں، وہی سیاست اسلامی تصورات سے ہمہ آہنگ ہوسکتی ہے۔

اسلام کی باطنی، روحانی اور پاکیزہ اخلاقی تعلیمات سے طبعی مناسبت نہ رکھنے والی جماعتیں روایتی جمہوری جماعتیں تو ہوسکتی ہیں، انہیں صحیح اسلامی جماعتیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ جدید جمہوریت کی بنیاد ہی مادی ترقی کے تصورات پر مبنی ہے، جدید جمہوری نظام کے تحت ہر سیاسی جماعت مجبور ہے کہ وہ پاکیزہ اخلاقی نصب العین سے عاری مادی ترقی وخوشحالی کا پروگرام پیش کرے اور اس کی بنیاد پر معاشرے میں اپنی حیثیت بنائے، وہ افراد معاشرہ کو داخلی، باطنی اور روحانی طور پرسکون سے کس طرح ہمہ آہنگ کرے گی۔ وہ ان کے باہمی تعلقات میں محبت کے اجزاء کس طرح داخل کرکے معاشرہ کو مستحکم کرے گی، اس طرح کے سوالات جدید جمہوری نظام کے تحت قائم جماعتوں کے دستور اور اس کی حکمت عملی میں سرے سے شامل ہی نہیں ہوتے۔

اس کا نتیجہ ہے کہ جدید جمہوری نظام میں رہنے والے افراد بے شمار نفسیاتی، روحانی اور

اخلاقی مسائل کا شکار ہوجاتے ہیں، اس طرح معاشرہ نفسیاتی مریضوں کے معاشرہ میں تبدیل ہوجاتا ہے نیز سیاست واہل سیاست کو افراد معاشرہ کی اس حالت زار کی درستگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

(۸۲) جمہوریت اور جمہوری سیاست کے جس المیہ کا ہم نے اوپر ذکر کیا، اس نکتہ کو ملک کے ممتاز دانشور کالم نگار اوریا مقبول جان نے اپنے ایک کالم میں بہت بہتر طور پر پیش کیا ہے، ہم ان کے بیان کردہ اس نکتہ کو انہی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

’’جمہوریت اور جمہوری سیاست کا المیہ یہ ہے کہ اس کی معراج اور کامیابی کی منزل مادی خوشحالی سے زیادہ نہیں۔ دنیا کے کسی بھی جمہوری ملک کی سیاسی پارٹی کے منشور کو اٹھا کر دیکھ لیں اس کے اندر دنیا میں کامیابیوں کی ایک طویل فہرست دی گئی ہوگی۔ بہت سے بلند بانگ دعوے کئے گئے ہوں گے کہ اگر ہم برسراقتدار آگئے تو صحت، تعلیم، صاف پانی، روزگار، شاندار مواصلاتی نظا، بہترین شاہراہیں، تجارتی منڈیاں اور کاروباری سہولیات میسر کریں گے۔ یوں ہمارے برسراقتدار آنے سے خوشحالی راج کرے گی۔ امریکہ ہو یا برطانیہ، فرانس ہو یا بھارت، تمام سیاسی پارٹیاں ایسے ہی دعوے کرتی ہیں اور اپنے ان دعوؤں کی تکمیل کے لیے اپنے زمانہ اقتدار میں کوشش بھی کرتی ہیں، تاکہ آئندہ بھی ان کا بھرم قائم رہے اور وہ اگلا الیکشن بھی جیت جائیں۔

دنیا بھر کے سیکولر، لبرل جمہوری نظام میں کسی سیاسی پارٹی کو فرد کے ذاتی دکھوں، خاندانی بکھیڑوں، نفسیاتی الجھنوں اور اخلاقی پستیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

کوئی سیکولر لبرل جمہوری پارٹی یہ دعویٰ لے کر کبھی نہیں اٹھے گی کہ وہ ایک ایسا نظام لے کر آئیں گے، جس میں والدین کو تنہا نہیں چھوڑا جائے گا۔ ان کی دیکھ بھال ان کے بچوں کے ذمہ ہوگی۔ وہ یہ دعویٰ تو کریں گی کہ ہم اتنے شاندار اولڈ ایج ہوم بنائیں گے کہ گھر سے بے گھر کئے گئے والدین کو کسی قسم کی کمی محسوس نہ ہو سکے، لیکن وہ اولاد کو گھر سے نکالنے پر کٹہرے میں نہیں کھڑا کرے گی کہ تم نے ان والدین کو کیوں بے آسرا کر دیا جنھوں نے تمہیں انتہائی مصیبت، محنت اور محبت سے پالا تھا۔

جمہوری سیاست کے ریڈار پر گھروں کے ٹوٹنے، طلاق کی شرح کے بڑھنے، اولاد کے بے راہ رو ہونے کے علاج کا بھی کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ وہ ایک مطلقہ کے لیے الاؤنس تو لگا سکتے ہیں، ایک ٹوٹے خاندان کے تنہا رہ جانے والے بچے کے لیے ہوسٹل اور تعلیمی سہولت تو فراہم کر سکتے ہیں، لیکن ان کے پاس گھروں کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔

اسی طرح معاشرے میں روزبروز خاندانی بے وفائیوں اور اخلاقی زوال کے نتیجے میں جو خاندانی نظام تباہ ہورہا ہے، کسی الیکشن میں اس خاندانی نظام کی بحالی کے لیے بھی کوئی نعرہ شامل نہیں ہوتا۔ البتہ گھریلو تشدد سے لے کر زبردستی ازدواجی تعلقات قائم کرنے پر قانونی تحفظ اور عدالتوں کے دروازے ضرور کھولے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی بھی کسی سیکولر، جمہوری اور لبرل معاشرے کی ترقی ناپی جاتی ہے تو اس کی پیائش میں شرح نمو، برآمدات اور درآمدات کا توازن، فاریکس ریزرو، سڑکوں کی حالت، ہسپتالوں میں فی ڈاکٹر مریضوں کی تعداد، سکولوں میں بچوں کے داخلے کی تعداد، شرح خواندگی، لیٹرین کی سہولت، سیوریج سسٹم یا صاف پانی کی سہولت کا تو ذکر ہوتا ہے لیکن بڑے سے بڑے کامیاب جمہوری معاشرے میں بھی ترقی ناپنے کا یہ پیمانہ کبھی نہیں ہوا کہ اس سال کتنے بوڑھے اولڈ ایج گھروں سے کم ہوئے، کتنی طلاقیں کم ہوئیں، بغیر شادی کم سن بچیوں میں ماں بننے کے رجحان میں کسی قدر کمی واقع ہوئی۔ کتنے بچے اس گزشتہ سال میں سنگل والدین، یعنی صرف ماں یا صرف باپ کی کفالت کی بجائے دونوں کی بیک وقت محبت کے مضبوط حصار میں رہے۔ یہ پیمانے انہوں نے انسان کی ذات پر چھوڑ دیئے ہیں اور یہ جدید جمہوری سیکولر لبرل ریاست کا موضوع ہی نہیں ہیں۔

ان کے نزدیک انصاف یہ ہے کہ عورت کس طرح عدالت سے اپنے بچے کو خاوند سے چھینتی ہے یا اولاد کیسے بوڑھے والدین کو فاتر العقل قرار دے کر ان کی جائیداد پر عیش کرتی ہے۔ یہ موضوع سیکولر، لبرل یا جمہوری معاشرے کا کیوں نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ تمام نظام ایک بہت بڑی کاروباری اسٹیبلشمنٹ ہے، جس میں ہر فرد اس کے کاروبار کو بڑھانے کے لیے کارآمد پرزہ ہے اور اسے مسلسل اس بہت بڑی فیکٹری، جسے ریاست کہتے ہیں، میں کام کرتے رہنا چاہیے۔ اسی لیے گھر کے ہر فرد کو ایک کردار یا رول دیا جاتا ہے جو اسے ادا کرنا ہوتا

ہے۔ ایک عورت کے گلے میں کبھی بھی اس بات پر میڈل نہیں پہنایا جائے گا کہ اس نے دو بچوں کی ایسی پرورش کی کہ ان میں نہ کوئی اخلاقی برائی ہے اور نہ نفسیاتی بیماری، بلکہ وہ کامیاب ترین علمی اور پیشہ وارانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر اس کو بہترین پائلٹ، شاندار نرس، بزنس ایگزیکٹو یا پیشے کے اعتبار سے کامیاب ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے تمغہ حسنِ کارکردگی سے لے کر اعلیٰ ترین اعزازوں سے نوازا جاتا ہے۔

اسی طرح کسی خدمت گزار بیٹے کے لیے ان معاشروں میں کوئی ایوارڈ نہیں، لیکن باپ کو دھکے دے کر گھر سے نکالنے والے کامیاب ادیب، شاعر، سول سرونٹ اور بزنس مین کو میڈل دیئے جاتے ہیں، ان کی یادگاریں قائم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سیکولر، لبرل جمہوری معاشروں میں کامیابی کے ذاتی معیار بھی دنیا کی مادی زندگی کی ترقی کے گرد گھومتے ہیں لیکن ریاست مدینہ کا مقصدِ اولیٰ تو بالکل مختلف تھا۔ انبیاءؑ دنیا میں کبھی بھی اس لیے مبعوث نہیں کیے گئے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے ہوئے یہ ترغیب دیں کہ اگر تم اللہ کی جانب آؤ گے تو تم مادی طور پر ترقی کروگے۔ ہرگز نہیں بلکہ اللہ تو اس کے بالکل الٹ بتاتا ہے۔ سورہ الانعام کی یہ چار آیتیں ریاست مدینہ کا مقصد اولیٰ متعین کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اور ہم نے تجھ سے پہلے بہت سی امتوں کے ہاں رسول بھیجے تھے، پھر ہم نے انہیں سختیوں اور تکلیفوں میں گرفتار کیا تاکہ وہ عجز و نیاز کو شیوہ بنائیں۔ پھر ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب ان کے پاس ہماری طرف سے سختی آتی تھی تو اس وقت وہ عاجزی کا رویہ اختیار کرتے؟ بلکہ ان کے دل تو اور سخت ہوگئے اور جو کچھ وہ کررہے تھے شیطان انہیں سمجھاتا رہا کہ وہ بڑے شاندار کام ہیں۔ پھر جب وہ اس نصیحت کو بھول گئے جو انہیں کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔ یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں پر خوش ہوگئے تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا، جس کے نتیجے میں وہ بالکل ناامید ہو کر رہ گئے۔ پھر ان ظالموں کی جڑ کاٹ دی گئی اور اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔'' (سورۃ الانعام آیت نمبر ۴۲۔ ۴۵)

اس وضاحت کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ ریاست مدینہ کا مقصد اولیٰ خوشحالی اور مادی ترقی ہے تو اسے جان لینا چاہیے کہ اللہ نے اسے اپنی پکڑ کی علامت بتایا ہے لیکن کمال ہے جمہوری نظام کی برکات کا کہ مسجد کے منبر ومحراب پر درس دینے والا، مدارس کا فارغ التحصیل عالمِ دین یا اسلام کے احیاء کا نعرہ بلند کرنے والا بھی جب جمہوری سیاست میں آتا ہے تو اس کے نزدیک بھی ریاستِ مدینہ کا تصور مادی ترقی کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔''

(۸۳) ہمارے معاشرے کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ملت کی بہتری کی کاموں کے حوالے سے اجتماعی طور پر بےحسی کی صورتحال پیدا ہوگئی ہے، حالانکہ دیندار طبقہ زندگی کے ہر شعبہ میں موجود ہے، لیکن دینی حوالے سے وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، مثلاً ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں ہزاروں سے زیادہ دیندار پروفیسر اور استاد صاحبان موجود ہیں، وہ اگر طلبہ کی بہتر سمت میں ذہنی خطوط کی تعمیر کے کام کو اپنے اہداف میں شمار کر لیں اور طلبہ سے ذاتی نوعیت کے تعلقات رکھکر، ان کی شخصیت پر اثر انداز ہوں تو بڑا کام ہو سکتا ہے اور بُرائی کی قوتوں کی روک تھام کی بہتر صورت پیدا ہوسکتی ہے، لیکن اس سلسلہ میں ایک تو بُرائی کی قوتوں سے مرعوبیت یا مرعوبانہ ذہنیت انہیں اس کام سے روک رہی ہے، اس کا دوسرا سبب حوصلہ وہمت کا فقدان ہے اور غیرجانبدارانہ روش کا مزاج ہے۔

حالانکہ بندہ مؤمن غیرجانبدار نہیں ہوتا، اس کی صلاحیتوں وتوانائیوں کا پلڑہ حق کے مقصد میں استعمال ہوتا ہے، اگر دیندار اہل علم واہل دانش میں بھی حمیت دین کا فقدان ہو تو پھر بُرائی کی قوتوں کی روک تھام مشکل ہوجاتی ہے۔

یہ بات بندہ مومن کے شان کے منافی ہے کہ وہ منکر کو کھلے عام، پرواں چڑھتے ہوئے دیکھے اور باطل افکار اور باطل تہذیب کی بڑھتی ہوئی یلغار کا مشاہدہ کرے اور پھر خاموش تماشائی بنا رہے اور اس سلسلہ میں کوئی قابل ذکر کردار ادا نہ کرے۔

اکبر الہ آبادی نے درج ذیل شعر میں اپنے دور کے افراد کی تصویر کشی کی تھی۔

پیدا ہوئے، پلے بڑھے
بی اے کیا، ملازم ہوئے
پنشن ملی اور مر گئے۔

اس وقت تو بےحسی کے اعتبار سے حالت ابتدائی نوعیت کی تھی، لیکن اب تو اس اعتبار

سے صورتحال نہایت تشویشناک ہوگئی ہے کہ بھاری تنخواہیں اور مراعات اور اپنی دنیا مستقبل کی فکر کے علاوہ دوسری کوئی فکر سرے سے موجودہ ہی نہیں۔

دین، ملت اورحق وصداقت کے فروغ کے حوالے سے اس اجتماعی بے حسی کا نتیجہ ہے کہ اللہ نے ہمیں ہماری حالت زار پر چھوڑ دیا ہے اور ہمیں بے رحم مادی قوتوں کے نذر کر دیا، جو ہماری نسلوں کی ذہنی، نفساتی اور تہذیبی بگاڑ کا سبب بن رہی ہیں۔

تعلیمی اداروں سے وابستہ دیندار پروفیسروں ولیکچراروں کا اللہ نے معاشی مسئلہ بھی بہت بہتر طور پر حل کر دیا ہے اور طلبہ کی ذہن سازی کا کام تو ان کی منصبی ذمہ داریوں میں بھی شامل ہے، لیکن اس معاملہ میں وہ رسمی ورواجی نوعیت کے کردار سے زیادہ کردار ادا کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اس بے حسی کا نتیجہ ہے کہ ملت کو ہر سال تعلیمی اداروں سے ایسے لاکھوں افراد فارغ ہوکر ملتے ہیں، جو اسلام کے پاکیزہ نصب العین کے شعور وادراک سے خالی ہوتے ہیں اور مادی خوشحالی کے علاوہ ان کے پیش نظر دوسرا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

موجودہ دور میں جب کہ ملت کی نسلیں مادیت کے عالمگیر طوفان سے دوچار ہیں، انہیں اس طوفان بچانے کے سلسلہ میں تعلیمی اداروں کے اساتذہ کی طرف سے کردار ادا نہ کرنا اور اپنی اس کمزوری کے لئے تاویلیں پیش کرنا بہت المناک بات ہے، بندہ مومن جو اللہ کی محبت سے سرشار ہوتا ہے، اللہ کی یہ محبت تو اسے باطل کے خلاف سراپا سعی وجہد بنا دیتی ہے، جب کہ ہمارے ہاں حالت اس سے مختلف ہے، کاش کہ اس سلسلہ میں تعلیمی اداروں سے وابستہ اساتذہ کرام اپنے حصہ کا بھرپور کردار ادا کرکے، قوم وملت کو پاکیزہ نصب العین کی حامل نسلیں فراہم کریں۔

(۸۴) مادیت پرستی کا سیلاب گھروں، درسگاہوں، دفتروں اور خانقاہوں کی دیواریں توڑ کر اندر داخل ہوچکا ہے، اس سیلاب کی ''خصوصیت'' ہی یہ ہے کہ یہ نفس پرستی کی قوتوں کو مشتعل کرتا ہے، ہر وقت حب جاہ وحب مال، اور مادی حسن پر فدائیت کے جذبات کو ابھارتا واکساتا ہے، فرد کی شخصیت پر دنیا کے چند دنوں کے مستقبل کی فکرمندی کو غالب کردیتا ہے۔

مادیت پرستی کا یہ سیلاب اتنا ہمہ گیر اور ہولناک ہے کہ اس سے بچنا آسان کام نہیں، اللہ سے والہانہ محبت وعشق کا تعلق ہی وہ حصار ہے، جو اس سیلاب سے بچاؤ کا واحد ذریعہ ہے۔ اسلام کی رسمی اور رواجی صورت سے اس سیلاب کی تباہ کاریوں سے نہیں بچا جا سکتا۔

مادہ پرستی کی عالمی قوتوں اور تہذیب جدید کے علمبرداروں کی ساری صنعت، ساری سیاست اور سارا مفاد اس بات سے وابستہ ہے کہ انسانیت میں زیادہ سے زیادہ مادہ پرستی کی روح کو پھونکا جائے اور اس کی سفلی قوتوں کو طاقتور بنایا جائے، تاکہ اس کے تیار کردہ مادی سامان کی زیادہ سے زیادہ کھپت کی صورت پیدا ہو اور انسانیت سراپا مادہ پرستی کا نمونہ بن جائے، جدید دور کی نئی نئی ٹیکنالوجی اور میڈیا کے نئے نئے طاقتور ذرائع کی ایجاد کے پس پردہ مقصد بھی یہی ہے کہ انسانیت کے اسفل ترین جذبات کو طاقتور بنا کر اسے مادیت، مادی حسن اور مادی زندگی کو خوشگوار بنانے کی جدوجہد پر اکسایا جائے۔

محسوس یہی ہوتا ہے کہ دجالی تہذیب اپنے درمیانی دور سے گزر کر، اپنے عروج کے دور میں داخل ہو رہی ہے، جہاں دجال کا ظہور کوئی زیادہ دور نظر نہیں آتا، دجالی تہذیب کی طاقتور طوفانی لہروں سے بچاؤ کی فکرمندی سارے کاموں سے اولین ترجیح کی مستحق ہے، اس مقصد کے لئے اللہ کی سچی محبت (جو مجاہدوں ہی سے پیدا ہوسکتی ہے) ہی وہ حصار ہے، جو مادی تہذیب کے ہر طرح کے فتنوں سے بچاؤ کا ذریعہ ہے، اس لئے کہ جب دلوں میں اللہ سے والہانہ محبت وعشق کی رَو دوڑنے لگتی ہے تو شیطانی وسفلی قوتوں کو راہ فرار اختیار کرنی پڑتی ہے، اللہ کی والہانہ محبت فرد میں اللہ کی معیت اور اللہ کی قوت ومدد کو شامل کردیتی ہے۔

(۸۵) اس نکتہ کو سمجھنا ضروری ہے کہ اللہ سے عشق کی راہ میں نفسانیت، عقلیت، ذہانت اور زیادہ علمیت عام طور پر حائل ہوجاتی ہے۔ چنانچہ مادیت کے تیز طوفانی لہر میں یہ ہتھیار زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتے، اس کے لئے اللہ کی سچی معرفت (جو انسانی فطرت کا خاصہ ہے) کو بیدار کرنا پڑتا ہے یہی معرفت فرد میں ففروا الی اللہ (اللہ کی طرف دوڑو) کی صلاحیت کو ابھارتی اور طاقتور بناتی ہے، اس طرح فرد مادیت پرستی کی قوتوں کے مقابلہ میں اللہ کی پناہ میں آجاتا ہے۔

اس لئے ہمارے مصلحین اور ملت کے دردمندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اداروں اور اپنی درسگاہوں میں دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ معرفت کی صلاحیتوں کی بیداری کا

خصوصی اہتمام کریں اور اس کام کو اپنے حلقہ سے وابستہ افراد کی ذاتی دلچسپی یا ذاتی پسند وناپسند کا مسئلہ قرار دے اس سے صرف نظر نہ کریں۔

یہاں ہم اس نکتہ کی مزید تشریح کرنا ضروری سمجھتے ہیں، ہمارا ایک دور وہ تھا جب افرادِ معاشرہ میں یہ شعور موجود تھا کہ تزکیہ، وتقویٰ اور ایمان کی گہرائیوں تک رسائی کے لئے حقیقی مزکی ومربی یعنی حقیقی اہل اللہ کی صحبت ضروری ہے، اس ادراک وشعور کی وجہ سے علم کے ساتھ ساتھ یا تحصیل علم کے بعد تقویٰ وتزکیہ کے حصول کے لئے افراد عام طور پر کسی نہ کسی مزکی ومربی کے ساتھ وابستہ ہوجاتے تھے اور ان سے صحبت ومحبت کا تعلق قائم رکھتے تھے، اس طرح مسلم معاشرہ ہر دور میں نفس پرستی اور مادیت پرستی کی تیز لہروں سے بڑی حد تک بچا رہا، لیکن موجودہ دور میں عقلیت کی تیز لہروں نے علمی حلقوں میں مزکی ومربی کی صحبت کے ذریعہ حاصل ہونے والی گہری ایمانی کیفیات اور روحانی بالیدگی کے شعور وادراک کو سلب کر دیا ہے۔

ان حالات میں ایک تو اس بات کی ضرورت ہے کہ مزکی ومربی کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے اور علمی طور پر اس نکتہ پر شرح وبسط سے گفتگو کی جائے کہ کتابوں سے علم حاصل ہوتا ہے جب کہ اس علم پر عمل کی صلاحیت پاکیزہ اخلاقی وروحانی قوتوں کی حامل مزکی ومربی شخصیتوں کی صحبت ومعیت سے پیدا ہوتی ہے۔

آج سے سو ڈیڑھ سو سال پہلے اس کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے کہ اس وقت جدیدیت اور عقلیت کی تیز لہروں کا فتنہ موجود نہ تھا۔

دوسری چیزیں جس کی سخت ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ معاشرہ میں ایسی مثالی خانقاہیں سامنے آئیں، جن سے وابستگی کے نتیجہ میں لوگوں کو قلبی سکون حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی سیرت وکردار کی تعمیر کا کام بھی بہتر طور پر ہوتا رہے۔

جس طرح حضرت مولانا الیاس رحمتہ اللہ علیہ نے وقت کی ضرورت کے پیش نظر دعوتی کام کے لئے نئے خطوط پر کام شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شروع کردہ یہ تحریک عالمی صورت اختیار کر گئی، اسی طرح دینی درسگاہوں کو ایسے مزکیوں ومربیوں کی تیاری کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے، جو اپنے پاکیزہ کردار کی کشش اور اپنی اخلاقی وروحانی قوتوں کی بدولت افراد کو نفس پرستی اور مادیت پرستی کے ماحول سے اوپر اٹھا کر ان میں اسلامیت کی حقیقی لہر پیدا کر سکیں، اور ان میں ہر طرح کے حالات میں دین اسلام پر چلنے کی استعداد پیدا کریں، اس وقت جب کہ مغرب کے مادیت پرست ماحول کے زیر اثر ہمارا بھی خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، افراتفری پیدا ہوگئی ہے، نفسانیت نے گھروں کے ماحول کو مکدر کر دیا ہے، روز روز کے جھگڑوں سے لوگوں کی زندگی زہر ہوگئی ہے، ان حالات میں جہاں عملیات کے ماہروں نے پیروں کی صورت اختیار کرکے لوگوں کو یہ باور کرنا شروع کیا ہے کہ تمہاری پریشانیوں کا حل ہمارے ہاں موجود ہے، اس طرح ان جعلی پیروں نے لوٹ مار کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا ہے اور عملیات کے ذریعہ پریشان حال لوگوں کو مزید پریشان کرنا شروع کر دیا ہے، اس طرح کے حالات میں اگر ہمارے بڑی بڑی جامعات میں علمائے دین کی تیاری کے ساتھ ساتھ اخلاقی وروحانی قوتوں کے حامل درویشوں کی تیاری کا کام بھی ہوتو یہ بہت بڑا کام ہوگا، جس سے ایک تو افراد معاشرہ کو ذہنی اور وجدانی طور پر سہارا حاصل ہوگا، دوسرے یہ کہ مادیت کی بڑھتی ہوئی لہر (جو ہمارے تہذیبی سرمایہ کو زیروزبر کرنے کا ذریعہ بن رہی ہے) اس کی روک تھام کی صورت پیدا ہوگی۔

ہمارے بعض ممتاز علماء کرام نے بعض بڑی بڑی جامعات قائم کرکے درسگاہوں کی سطح پر مثالیں قائم کی ہیں، ان درسگاہوں کی یقیناً غیرمعمولی اہمیت ہے کہ معاشرے کو محلّہ کی سطح تک قال اللہ قال الرسول کا پیغام پہنچانے والے افراد مہیا ہیں، لیکن ساتھ ساتھ پاکیزہ روحانی صلاحیتوں کے حامل افراد کی تیاری کا کام بھی انتہائی ضروری ہیں۔

پہلے ہمارے معاشرہ کی صورت ایسی تھی کہ اس طرح کے درویش صفت مزکی ومربی ازخود معاشرہ کو دستیاب ہوجاتے تھے، اس لئے کہ افراد میں تزکیہ کے کام کے لئے طلب موجود تھی اور طلب کے ساتھ افراد ازخود مجاہدوں کے لئے تیار ہوجاتے تھے، اب یہ طلب ختم ہوگئی ہے، اب اس کام کے لئے منصوبہ بندی کی ضرورت ہے، جس طرح ظاہری مدارس کی تعمیر کے لئے منصوبہ بندی سے کام ہورہا ہے، اسی طرح اب روحانی محاذ پر کام کے لئے بھی ممتاز علمائے کرام کو منصوبہ بندی سے کام لینا چاہئے۔

ان خطوط پر سوچ اگرچہ نئی بات ہے، لیکن نئی بات سے انشاء اللہ معاشرہ کو اخلاقی

وروحانی طور پر سنبھالنے کی نئی صورت پیدا ہوگی۔

(۸۶) راہ محبت کی ایک خصوصیت (جس کا طالب کو روز مرہ زندگی میں مشاہدہ ہوتا رہتا ہے) یہ ہے کہ اللہ کے جلالی صفات کے عکس سے نفسی قوتوں کی پامالی کا مسلسل عمل جاری رہتا ہے، اس لئے طالب جہاں اللہ کے جمالی صفات کے عکس سے حلاوت وخوشی کے بے پناہ احساسات سے سرشار ہوتا ہے، وہاں وہ جلالی صفات سے اضطراب کے انگاروں سے بھی دوچار ہوتا رہتا ہے، چونکہ نفس کی ہولناک قوتیں عرصہ تک اللہ کے جلالی صفات کے عکس کے ورود کے بغیر مہذب نہیں ہوتی، اس لئے طالب کے لئے اضطراب کے انگاروں سے گزرے بغیر چارہ کار نہیں۔

راہ سلوک ومحبت کے طالب کی اپنی مصلحت اس میں ہوتی ہے کہ وہ نفس پر پڑنے والی اللہ کی ان جلالی نوعیت کی تجلیات کو صبر وحوصلہ سے سہنے کا سلیقہ سیکھے، اس کے سلیقہ انسانیت سے بہرہ وری اور تزکیہ نفس کی صلاحیتیں اسی سے وابستہ ہیں۔

اگرچہ اضطراب کے یہ حالات طالب کے لئے بہت صبر آزما اور دشوار گزار ہوتے ہیں، لیکن اس کے بغیر نہ تو نفس کی ہولناک قوتوں کے بتدریج مشاہدہ کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی تزکیہ کا عمل مکمل ہوتا ہے۔

طالب جو عام طور پر راہ سلوک کی اس دشوار گزار گھاٹی اور نفس پر گرنے والے اضطراب کے انگاروں کی نوعیت سے آشنا نہیں ہوتا، وہ اپنی اس حالت کو بعض اوقات جسمانی نوعیت کی بیماری سمجھنے لگتا ہے، لیکن طالب کو اس نکتہ کا استحضار ہونا چاہئے کہ یہ خالص روحانی بالیدگی اور نفسی قوتوں کی پامالی کی راہ کے لوازمات کا حصہ ہے، جب تک وہ تہذیب نفس کے قابل ذکر مراحل سے گزرنے میں کامیاب نہیں ہوتا، تب تک اسے ہر صورت میں اضطراب کے ان انگاروں سے گزرنا ہی پڑے گا۔

سلیقہ انسانیت اور تزکیہ کی صلاحیتوں سے بہرہ وری آسان کام نہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ مشکل ترین کام ہے، تزکیہ نفس کے جس کام سے جہنم سے بچاؤ اور جنت میں داخلہ کی سعادت حاصل ہو، اس کام میں جتنی بھی مشکلات ہوں، انہیں مشکلات نہیں، بلکہ محبوب حقیقی کا انعام سمجھنا چاہئے کہ اس نے اس راہ پر چلنے کی توفیق اور سعادت عطا فرمائی ہے، ورنہ نفس کی دلدل ایسی ہے جس دلدل میں لگ بھگ ہر فرد گردن تک پھنسا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے جس بندہ پر اپنا فضل خاص فرماتا ہے اسے نفس کی دلدل سے نکالنے کی خاطر اس پر اپنی تجلیات کا ورود فرماتا ہے، یہ تجلیات کبھی جمالی نوعیت کی ہوتی ہیں تو کبھی جلالی نوعیت کی۔

جب نفس کی فنائیت یعنی نفسانی خواہشوں اور نفسی قوتوں کا زور قابل ذکر حد تک ٹوٹ جاتا ہے، اس کے بعد ہی طالب کو ایک نئی حلاوت کی زندگی عطا فرمائی جاتی ہے، جسے قرآن نے حیوٰۃ طیبہ یعنی پاکیزہ زندگی اور لذیذ زندگی سے عبارت کیا ہے۔

راہ سلوک کے حوالے سے اس نکتہ کے آشکار ہونے کے بعد یہ سفر آسان ہونے لگتا ہے، ویسے بھی سلوک کا یہ سفر اللہ کے فضل خاص ہی سے طے ہوتا ہے، اس سے اس کا فضل خاص طلب کرتے رہنا چاہئے۔

(۸۷) نفسانفسی اور مادی سرگرمیوں کی گہما گہمی کے ماحول میں اللہ کی محبت کی زندگی کو ترجیح دینا اور روزانہ موت کے سے حالات سے گزر کر، نفس کو مہذب بنانا اور اس سلسلے میں محبوب حقیقی کی طرف سے کیفیات کی سلبی وبحالی جیسے حالات کو صبر وشکر سے برداشت کرتے رہنا، بلکہ ہر طرح کے حالات میں سر تسلیم خم کرنا، یہ عاشق صادقوں ہی کا کام ہے، یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

عاشقوں کو اللہ نے ایسا سوز دل عطا کیا ہے، جو محبوب کے لئے ہر وقت تڑپتا رہتا ہے اور محبوب حقیقی کی صحیح قدر دانی نہ کرنے اور اس کی محبت کے صحیح آداب بجا نہ لانے پر سخت نادم بھی رہتا ہے، طالب صادق، نفس کے ساتھ مسلسل حالت تصادم میں رہتا ہے، اس کا اضطراب کبھی تو محبوب کے جلالی صفات کے عکس کی وجہ سے ہوتا ہے، یہ عکس طالب کو اپنی حالت زار اور حالت فراق پر روتے رہنے اور محبوب کے سامنے دکھی دل کے ساتھ آہ وزاری کرنے پر اکسانے کا موجب بنتا ہے تو کبھی یہ اضطراب ذکر سے غفلت، کثرت گوئی، دنیا میں ضرورت سے زیادہ مصروفیت، اور اپنی ضروریات زندگی کے لئے اہل دنیا کی طرف نگاہ جمانے جیسے گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔

گناہوں کی وجہ سے ہونے والے قبض واضطراب میں ظلمات وکدورت کے احساسات زیادہ ہوتے ہیں، جب کہ نفس کی تربیت وتہذیب کے سلسلے میں محبوب کی طرف سے پڑنے

والی جلالی صفت کے عکس سے پیدا ہونے والی بے چینی میں ایک طرح کی راحت بھی پوشیدہ ہوتی ہے، اگرچہ یہ راحت بظاہر محسوس نہ ہوتی ہو، تاہم اس کا اثر قبض کی حالت ٹوٹنے کے فورا بعد بسط اور شرح صدر کی صورت میں ہوتا ہے۔

قبض و بے چینی کا ہر دور محبوب کی طرف طالب کے سفر کو مزید آگے بڑھانے اور طالب کے اندر نئے حوصلہ وہمت کو پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔

طالب صادق کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کے پاس محبوب کے لئے وقت ہی وقت ہوتا ہے، چونکہ نفس کو مہذب بنا کر محبوب کی رضامندی کے لئے جدوجہد اس کی زندگی کا ہدف ہوتا ہے، اس لئے اس کے سارے کام اسی ہدف کے تابع ہوتے ہیں،اس کے پاس دنیاوی مصروفیات اور وقت کی کمی کا عذر لنگ نہیں ہوتا، اس لئے کہ طالب صادق کو اس بات پر شرح صدر حاصل ہوتی ہے کہ اس کا جو وقت اللہ محبوب کی محبت میں صرف ہوتا ہے، اصل قیمتی وقت وہی ہوتا ہے، باقی وقت تو ضایع ہوجاتا ہے، روزی میں برکت، وقت میں برکت اورعلم میں برکت وغیرہ یہ سب محبوب کی طرف سے ہوتی ہے، جس کا حقیقی طالب کو آئے دن مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔

وقت کی کمی اور معاشی مصروفیات کا عذر لنگ دراصل خام طالب کی خصوصیت ہوتی ہے، جس کا نفس تاویلات کے ذریعہ محبوب کی راہ پر سست رفتاری سے چلنے کے بہانے تراشتا رہتا ہے، طالب صادق کو مشاہدہ ہوتا ہے کہ محبوب کے لئے اپنی توانائیوں کے استعمال اور زیادہ سے زیادہ وقت کی قربانی دینے کے نتیجہ میں اس کے دن بھر کا کام گھنٹے دو میں کر دیا جاتا ہے، اس برکت کے مشاہدہ کی وجہ سے طالب صادق کے پاس محبوب کے لئے وقت کی کمی نہیں ہوتی، اسے تو بس ایک ہی شکایت ہوتی ہے کہ کمزور جسم اور مٹی کا بنا ہوا یہ جسمانی ڈھانچہ محبوب کی راہ پر مسلسل چلتے رہنے میں پوری طرح ساتھ نہیں دیتا، وہ جلد ہی تھک جاتا ہے، اس طرح اس جسمانی ڈھانچہ کے ساتھ محبوب کی قدر دانی کا معمولی حق بھی ادا نہیں ہوتا، اگرچہ طالب صادق کی ہرچیز میں برکت ہوتی ہے، جسمانی توانائی میں بھی دوسروں سے زیادہ لطافت ہوتی ہے، تاہم چونکہ محبوب کے قرب کے لامحدود مقامات ہیں، ان مقامات کو دیکھتے ہوئے اس کی آرزو ہوتی ہے کہ بس وہ مسلسل اور مستقل مزاجی سے محبوب کی راہ پر چلتا رہے، اس سلسلے میں جسم کی طرف سے پوری طرح ساتھ نہ دینے کی وجہ سے وہ حسرت کرتا ہے کہ کاش کہ جسم بھی روح کی طرف لطیف ہی ہوتا،جو تھکنے کا نام نہ لیتا۔

راہ محبت میں چلنے والا ہر طالب خوش نصیب ہے اور وہ معاشرہ کی کریم ہے، اس لئے کہ دنیا کی بقا، ان کے اللہ اللہ کرنے سے وابستہ ہے، ایک لحاظ سے وہ دنیا کی بقا کا ذریعہ ہے، ورنہ اللہ اللہ کے بغیر دنیا کی بقا کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

طالب کو جب مسلسل ذکر کی توفیق نصیب ہوتی ہے تو وہ اپنی اس خوش نصیبی پر اللہ کا تشکر بجالاتا ہے اور دعا گو ہوتا ہے کہ اس نعمت میں اسے دوام حاصل ہو، اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اسے اللہ کی محبت اور اس کے ذکر کی نعمت کیا ملی ہے کہ گویا اسے دنیا جہاں کی سعادتیں حاصل ہوئی ہیں، ان سعادتوں کے حصول پر وہ اپنے مولا کا جتنا بھی شکر بجالائے کم ہے۔

راہ محبت میں چلنے والے ہر طالب کو پاکیزہ کیفیات واحساسات میں سے ایک حصہ ملنے لگتا ہے، یہ پاکیزہ احساسات وکیفیات اگر شب وروز کا زیادہ حصہ رہنے لگیں اور اعمال صالحہ کے بھرپور صدور کا ذریعہ بنیں تو گویا دنیا میں اس کے لئے مادی نعمتوں کی تکمیل کی صورت پیدا ہوئی۔

محبت کا راہی دنیا کی بہتات اور مادی خوشحالی کو اپنے لئے ابتلا وآزمائش سمجھنے لگتا ہے، اس لئے وہ ہرممکن حد تک اس سے بچنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، اس لئے کہ دنیا کی یہی آفت کوئی کم نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے عاشق کی توجہ بٹتی ہے اور اس کی قلبی یکسوئی متاثر ہوتی ہے۔

جو طالب ذکر اورصحبت کے لئے فیاضی سے وقت نکالنے میں کامیاب ہے، وہ تو خوش نصیب تریں فرد ہے، اس لئے کہ ایسے طالب پر رفتہ رفتہ محبوب کی فکرمندی احاطہ کر لیتی ہے، اس کی مادی ضروریات کے لئے محبوب کافی ثابت ہوتا ہے۔

ایسا طالب جو ذکر کے لئے اپنی مصروفیات میں سے کافی وقت نکالتا ہے، یا اس کی فکرمندی میں رہتا ہے، اس طرح کا طالب بھی خوش نصیب ہے، اس لئے کہ ایسا طالب اللہ کے جلالی وجمالی صفات کی تجلیات میں زیادہ رہنے لگتا ہے، جس سے وہ پیچ وتاب کھاتا رہتا ہے اور وہ باطنی طور پر حالت تہلکہ میں رہتا ہے، اس کی ذکر کی کمی محبوب کے تجلیات کے

ورود سے پوری کردی جاتی ہے۔ لیکن زیادہ تر خام طالب ہوتے ہیں، جو اللہ کی محبت اور ذکر کے لئے وقت نکالنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، ان پر دنیا کو ہر صورت میں ترجیح دینے کا مزاج غالب ہوتا ہے، اس طرح کے طالب جلد ہی مادیت کی طوفانی لہروں کی نذر ہوجاتے ہیں، سنبھالنے کی ساری کوششوں کے باوجود وہ سنبھلنے نہیں پاتے، سبب یہ ہے کہ دنیا دار دوستوں کے ماحول میں زیادہ وقت رہنے کی وجہ سے دنیا ان کے لئے سب سے زیادہ مرغوب ومحبوب ہوجاتی ہے۔ اس طرح کے افراد زندگی بھر مصائب ومسائل کا شکار رہتے ہیں۔ دنیا کے دروازے کھول کر بھی انہیں آزمایا جاتا ہے تو حوادث کی صورت میں بھی۔ اس کے باوجود نہ سنبھلنے کی وجہ سے انہیں نفس پرستی کی قوتوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔

یہ بہت بڑی سزا ہے دنیا میں اس سے بڑھکر کوئی سزا نہیں ہوتی، یہ سزا اس لئے ملتی ہے کہ ایک بار راہ محبت کی لذت سے آشنائی کے بعد اس کی بے قدری کی گئی، اللہ ہمیں اس سزا سے بچائے۔

(۸۸) زندگی ایک بار ملتی ہے، نہ کہ سو بار، ایک بار ملنے والی زندگی کو دنیا کی لھو ولعب میں خرچ کرنا سب سے بڑی نادانی ہے، پھر ایک بار ملنے والی زندگی کی حالت بھی یہ ہے کہ وہ برف کی طرح پگھلنے لگتی ہے اور اس طرح گزر جاتی ہے کہ فرد پیچھے مڑکر دیکھتا ہے تو ساٹھ ستر سال کی زندگی چند دنوں کی محسوس ہوتی ہے۔

اس زندگی کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے، جب یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ اسی زندگی پر ابدالاباد والی زندگی کی نجات کا دارو مدر ہے۔

اللہ نے ہر انسان کی فطرت میں اپنے ساتھ محبت کے طاقتور جذبات ودیعت کر دیئے ہیں، جو فرد کو ابدالاباد کی زندگی میں اللہ کے مشاہدہ کی نعمت عظمیٰ کے حصول کے لئے اکساتے رہتے ہیں، لیکن ان پاکیزہ جذبات پر نفسی خواہشات اور مادیت کو غالب کرنے کے نتیجہ میں فرد سراپا نفس پرست ومادیت پرست یا غافل انسان بن جاتا ہے۔ غافل انسان اور اللہ کے درمیاں وحشت کی فضا پیدا ہوجاتی ہے۔

ایک دردمند اور فکر مند انسان یہ سوچتا ہے کہ ایسے الفاظ کہاں سے لائے جائیں، جو بجلی کی سی تاثیر رکھتے ہوں اور جو افراد کی زندگیوں میں تغیر وتبدل اور بیداری کا ذریعہ ثابت ہوں، بالآخر وہ اس معاملہ میں اپنے آپ کو قاصر ولاچار محسوس کرتا ہے اور اس نکتہ پر آکر دم بخود ہوجاتا ہے کہ خیر وشر کی کشمکش کے یہ سارے تقدیری معاملات ہیں، ان معاملات میں زیادہ الجھنے سے بچنا چاہئے، فرد کی اپنی ذمہ داری بس اتنی ہے کہ وہ اپنی اصلاح کے لئے آخری حد تک کوشاں رہے اور اپنے متعلقین کو حکمت اور فہم فراست سے سمجھانے کا کام کرتا رہے۔

(۸۹) انسانی زندگی کی اس نوعیت کو سمجھنا از حد ضروری ہے کہ یہ زندگی امتحان گاہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس امتحان گاہ میں مختلف صلاحیتوں کے حامل افراد کو مختلف پیپر دیئے گئے ہیں، غریب ہو، یا امیر، عالم ہو یا غیر عالم، حکمراں ہو یا آفیسر، تاجر ہو یا سرمایہ دار، سب کو اپنے اپنے دائرں اور اپنی صلاحیتوں کے میدان میں آزمایا جارہا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں وتوانائیوں کو کس مقصد میں استعمال کر رہے ہیں، دائرہ کار سب کا مختلف ہے، لیکن آزمائش ایک ہی ہے اور وہ آزمائش یہ ہے کہ فرد کی زندگی کا ہدف اللہ محبوب کی رضامندی ہے یا خواہشات نفس کی تسکین وتکمیل اور مادی زندگی کی لذت کا حصول، یہی وہ آزمائش ہے، جس کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی ہے، اور جس کی خاطر فرد وافراد کو جسمانی صلاحیتیں وتوانائیاں دی گئی ہیں، غریب کی آزمائش یہ ہے کہ وہ غربت کے ساتھ صبر وشکر اور اللہ کی رضامندی اور اس کی اطاعت کی زندگی بسر کرتا ہے یا نہیں، تاجر، سرمایہ دار اور حکمراں وآفیسر کی آزمائش یہ ہے کہ وہ دولت اور اقتدار کے ہوتے ہوئے دوسروں کے حقوق پامال کرنے، غرور، بڑے پن اور دنیا ومادیت میں مستغرق ہوتا ہے یا اللہ کی رضامندی کو مقصود بنا کر حکمراں آفیسر، تاجر اور سرمایہ دار کی حیثیت سے زندگی گذارتا ہے۔

یہی وہ آزمائش ہے جس کے لئے یہ دنیا سجائی گئی ہے، **الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً** (وہ اللہ ہی ہے جس نے موت اور زندگی پیدا کی ہے تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے) اس مقصد کے لئے اختیار کی بھی آزادی دی گئی ہے کہ جو فرد جس قسم کی زندگی اختیار کرے گا، اس پر کوئی قدغن نہیں، اسے اپنے پسندیدہ نقشہ کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی حاصل ہوگی، اصل فیصلہ آخرت میں ہوگا، دائمی کامیابی وناکامی جنت وجہنم کی صورت میں ہوگی۔ البتہ اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں وتوانائیوں کو

اللہ کی اطاعت وعبادت اور اس کی خوشنودگی کے مقصد میں استعمال کرنے کی وجہ سے بندہ مؤمن کی جنت کا آغاز اسی دنیا سے شروع ہوجاتا ہے کہ اسے قلبی سکوں کی نعمت ملتی ہے، اس کا ضمیر ہر طرح کے حالات میں مطمئن ہوتا ہے، دنیا کے حادثات سے وہ زیادہ متاثر نہیں ہوتا، اسے ہر طرح کے حالات میں صبر وشکر کی نعمت عطا ہوتی ہے، اگر وہ مادی نوعیت کی نعمتوں سے بہرہ ور ہے تو اپنی ان نعمتوں میں وہ اللہ کے دوسرے مستحق بندوں کو شریک کرتا ہے اور ایسا کرنے سے اسے بے پناہ مسرت حاصل ہوتی ہے، لوگوں کے حوالے سے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی ادائیگی سے بھی اس کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے۔

جب کہ نفس پرست انسان کی بے سکونی وبے قراری کا آغاز اسی دنیا سے ہوجاتا ہے کہ ہر طرح کی مادی خوشحالی کے باوجود گناہوں ونافرمانی کی ظلمات اس کا احاطہ کردیتی ہے، وہ سکون اور روحانی مسرت کے لئے ترستا رہتا ہے۔

ان دونوں طرح کے انسانوں کی زندگی کا موازنہ کرنے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اللہ کی دی ہوئی توانائیوں کو اس کی رضامندی کے مقصد میں استعمال کرکے، دونوں دنیاؤں میں حقیقی سعادت سے بہرہ ور ہونا چاہئے، یہی سب سے بڑی دانشمندی ہے، سرمایہ داری اور مالداری کی چمک تو ایک خوشگوار بہلاوا ہے، جس کے پس پردہ دکھوں وغموں اور احساس محرومیوں کی ایک نہ ختم ہونے والی دنیا ہے، مالداری کی چمک سے متاثر ہوکر قیمتی زندگی کے سرمایہ کو ضایع کرنا، متاع زندگی کو ضایع کرنے کے مترادف ہے اور امتحان میں ناکام ہونا ہے، دنیاوآخرت دونوں میں اس کی سزا سے بچنا ممکن نہیں۔

(۹۰) ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کامیاب اور بہتر بنانے اور زندگی کے دشوار گزار اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لئے تدابیر اور ذرائع ووسائل کو ہر ممکن حد تک استعمال کرتے ہیں، معاشی، فنی اور رواجی تعلیم کے حصول میں پندرہ بیس سال صرف کردیتے ہیں، تاکہ بہتر روزی حاصل ہو سکے، ملازمت ملنے یا کاروبار کے بعد ہماری جدوجہد کا ایک نیا دور شروع ہوجاتا ہے، اس طرح ہم اپنی دنیاوی زندگی بنانے کے لئے تدابیر اور ذرایع ووسائل کو بھرپور طریقہ سے اختیار کرتے ہیں، ایسا کرنا ایک حد تک صحیح بھی ہے، لیکن اپنے مولا سے حقیقی تعلق پیدا کرنے، اس سے وفاداری کا رشتہ استوار کرنے اور انفرادی واجتماعی زندگی میں اس کے احکامات بجالانے کے کام کو ہم کوئی اہمیت دینے کے لئے تیارنہیں، ہم وسائل ہی کو مقصود کا درجہ دیکر اس میں کھوجاتے ہیں اور اپنی ساری توانائیاں ان وسائل کے حصول کی جدوجہد میں خرچ کردیتے ہیں اور وسائل کی خالق ہستی کو فراموش کردیتے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ تدابیر ووسائل، خیر وبرکت سے محروم رہتی ہیں، بلکہ ہمیں انہیں وسائل کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔تجربہ یہ ہے کہ جتنے زیادہ وسائل دستیاب ہوجاتے ہیں، ہماری ضروریات کی فہرست میں اتنا زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے اور مادی وسائل کے حصول کے لئے ہماری حالت قابل رحم ہونے لگتی ہے نیز اس سے بیماریوں، نقصانات، حوادث اور مادی خسارے اسی حساب سے ہمارا گھیراؤ کر لیتے ہیں۔

وسائل کو مقصود بنانے اور مادیت کی دلدل میں مبتلا ہونے کا نتیجہ ہے کہ ایک تو ہم اللہ کی مدد ونصرت اور اس کی طرف سے حاصل ہونے والے خیر وبرکت سے محروم ہوگئے ہیں، دوم یہ کہ ہم سے ذہنی وقلبی سکون کی دولت چھن گئی ہے، سوم یہ کہ ہم دنیا کی دوسری قوموں کے لئے عبرت بن گئے ہیں کہ ہماری انفرادی واجتماعی زندگی کی کوئی کل درست نہیں رہی اور ہم روزی کی تلاش میں مارے مارے غیروں کے ہاں پناہ لے رہے ہیں۔

اللہ کی اطاعت، اس کی وفاداری، ایمان ویقین کی مستحکم حالت، مظاہرہ عبدیت اور آداب بندگی یہ ایسی چیزیں ہیں، جن سے اللہ کی مدد ونصرت کا خاص قانون وابستہ ہے،یہ قانون اہل ایمان کی مذکورہ اعمالی حالات کی بنا پر ہی ان سے لاگو ہوتا ہے۔

اللہ نے تو اپنے بندوں سے وفاداری کے رشتہ کے استحکام کے نتیجہ میں اس دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا وعدہ فرمایا ہے، انفرادی طور پر تقویٰ اور نیکی کی زندگی اختیار کرنے کی صورت میں بھی یہ وعدہ ہے تو اجتماعی طور پر اعمال صالحہ کی صورت میں بھی۔ اور یہ بات واضح ہے کہ اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

قرآن کی بہت ساری آیتوں میں اس وعدہ کی تکرار ہے۔ **وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ** (اگر یہ دیہاتی ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کے لئے زمین وآسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے)۔

وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا (جو تقویٰ اختیار کرتا ہے ہم اس کے کاموں میں

آسانی پیدا کردیتے ہیں)۔

لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوْا فِيْ هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الآخِرَةِ خَيْرٌ. نیکوں کاروں کے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی خیر ہے تو آخرت میں بھی بہتری ہے۔

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْأَشْهَادُ . (اور ہم اپنے پیغمبروں اور مومنوں کی اس دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں تو جس دن گواہ کھڑے ہوں گے)۔ (اس دن بھی)

الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ . (وہ جو ایمان لائے اور پرہیزگار رہے ان کے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے تو آخرت میں بھی)۔

وَّأَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَأَسْقَيْنَاهُمْ مَّآءً غَدَقًا. (اور اگر یہ لوگ سیدھے رستے پر قائم رہتے تو ہم ان کو خوب سیراب کرتے)۔

اس طرح کی قرآنی آیات بتاتی ہیں کہ ایمان، عمل صالحہ اور تقویٰ کے نتیجہ میں مومنوں کو اس دنیا میں جو زندگی عطا ہوتی ہے، وہ خوشی، فوز وفلاح اور خیر وبرکت کی زندگی ہوتی ہے، دنیا کا جو حصہ ان کے مقدر میں ہوتا ہے، وہ تو انہیں مل کر رہتا ہے، لیکن روحانی، باطنی اور نفسیاتی طور پر بھی ان کی یہ زندگی پاکیزگی اور بے پناہ مسرت کی زندگی ہوتی ہے۔ دائرہ ایمان سے خارج افراد اس طرح کی پاکیزہ اور مسرت کی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ان آیات کو دیکھکر ہمیں اپنی حالت کا جائزہ لینا چاہئے کہ مادی ذرائع ووسائل کو مقصود بنانے اور مادی وسائل کے حصول کی جدوجہد میں فنائیت کے مظاہرے اور وسائل کی خالق ہستی کو بھلا دینے کی ہمیں جو سزا مل رہی ہے کہ ہم نہ دنیا کے رہے، نہ آخرت کے۔ نیز ذرائع ووسائل میں برکت رخصت ہوگئی ہے، زندگی اضطراب کے انگاروں پر لیٹنے کے مترادف ہوگئی ہے۔

ان حالات میں بیدار ہونے اور سنبھلنے کی ضرورت ہے، اپنے اپ کو کافر قوموں کی طرح پیسے بنانے کی مشین سمجھنے کی بجائے اس زندگی کو اللہ کی رضامندی اور اس کے آداب بندگی کے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہئے، معاشی جدوجہد کو مناسب وقت دینا چاہئے، اس سے زیادہ نہیں۔

اللہ کی مدد کے قانون کا مستحق بننے کے لئے نفس کے ساتھ مجاہدہ کا عمل ضروری ہے تاکہ اللہ کی اطاعت وعبادت وذکر وفکر کی راہ میں نفسی قوتوں کی مزاحمت کی حالت مضمحل ہوجائے ور زندگی بھر کے معاملات میں اللہ کے احکامات کی بجا آوری کا کام آسان ہوجائے۔

یہ کام ایسا ہے جس کے لئے وقت چاہئے، وقت کے بغیر چارہ کار نہیں، معاشی جدوجہد کے لئے تو ہم دس بارہ گھنٹے نکالیں، لیکن اللہ کی عبادت واطاعت کے ملکہ کو مستحکم کرنے کے لئے ہم ۲۴ گھنٹوں میں دوچار گھنٹے بھی نہ نکال سکیں اور اس کے لئے مصروفیت کے بہانے بنائیں۔

ہمیں اگر اللہ کی اطاعت اور عبادت کے فوائد وثمرات کا مشاہدہ حاصل ہوجائے اور اس کی وجہ سے ہونے والے اللہ کی مدد ونصرت کے قانون سے آشنائی حاصل ہوجائے تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ذرائع ووسائل میں فنائیت اور اس کو مقصود بنانے کی ہماری موجودہ حالت ختم ہوسکتی ہے اور ہم دنیا کے رعب اس کی دہشت اور اس کے عارضی مستقبل کی فکرمندی سے بلند ہو سکتے ہیں۔

دنیا کی فکر میں کھوجانے اور اسے مقصود بنانے کے عمل کی یہ خصوصیت ہے کہ فرد نہ چاہتے ہوئے بھی دولت کا بندہ بن جاتا ہے، اور دولت کی حرص وہوس اس پر اتنی حاوی ہوجاتی ہے کہ دولت ہی اس کا معبود بن جاتی ہے، چاہے رسمی طور پر فرد بعض مذہبی رسوم بھی ادا کرتا ہو اور پوجا پاٹ بھی کرتا رہے، لیکن اس کا اصل معبود دولت بن جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ قساوت قلبی کا شکار ہوجاتا ہے اور نصیحت کی باتیں اس پر اثر انداز نہیں ہوتی، دولت کی اس ''خصوصیت'' کی وجہ سے ہی رسول اللہ ﷺ نے دینار اور درہم کے بندہ کو بدعادی ہے کہ وہ گرے اور نہ اٹھے۔

رسول اللہ ﷺ، جو رحمتہ للعلمین ہیں، وہ دولت دینار کے بندہ کو بددعا دیں، اس سے دولت کے جنوں کی تباہ کاریوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ہمیں مادیت اور دنیاداری کی فکرمندی سے اوپر اٹھنے کے لئے سنجیدگی سے کام لینا ہوگا، دوسری صورت میں دونوں جہانوں کے خسران سے بچنا دشوار ہوجائے گا۔

ویسے بھی ہمارے پاس جو کل سرمایہ حیات ہے وہ وقت ہی ہے، وقت کے صحیح استعمال سے ہی ہمیں اس دنیا اور آخرت میں راحت ہی سعادت حاصل ہوسکتی ہے۔

(۹۱) غلبہ اسلام اور احیائے اسلام کی طاقتور تحریک، ہمارے معاشرہ کی سب سے اہم ضرورت ہے، جس کے بغیر نہ تو ہماری اجتماعی قومی زندگی کی بگڑی ہوئی حالت میں تبدیلی کے آثار پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ہمہ گیر بحران سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔

طاقتور اسلامی تحریک سے ہماری مراد سیاسی، علمی اور محض معاشی نوعیت کی تبدیلی کی تحریک نہیں ہے، بلکہ ایک ہمہ جہتی تحریک ہے، جو افراد معاشرہ کو اپنی پاکیزہ تہذیبی بنیادوں پر تبدیل کرنے، ان کے دل ودماغ اور روح میں تہلکہ برپا کرنے اور ان کی فاسد عادتوں کو بدلنے کا کردار ادا کرے اور ذاتی مفاد پر اجتماعی ملی مفاد کے احساسات کو غالب کردے، وقت کا چیلنج ایسا ہے جو اپنے تہذیبی اور کلچرلی بگاڑ اور ذہنی ارتداد کے لئے فضا کو تیزی سے سازگار بنا رہا ہے اور دنیا کی ساری باطل قوتوں نے اپنی پوری قوت اس کام میں صرف کردی ہے کہ امت کو اپنی تہذیب، اپنے اعتقادی نظام اور اپنے پاکیزہ نظریہ حیات پر قائم رہنے نہ دیا جائے۔

اس طرح کی صورتحال میں اپنی ملت کی بقا اور تحفظ کی سلامتی اس بات سے وابستہ ہے کہ معاشرہ میں احیائے اسلام اور غلبہ اسلام کی ہمہ جہتی تحریک شروع ہو اور وہ طاقتور ہو۔

یہ کام ایسا ہے جس کے لئے اپنے جماعتی اور دائرتی خولوں سے بلند ہوکر ملت کی فکر کو غالب کرنا ہے، یعنی اس کے لئے وسعت فکری اور وسعت ظرفی ناگزیر ہے، ہدف ملت کی بہبودی وبہتری ہو، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا جسے مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی نہ ہو، وہ ہم میں سے نہیں اس وقت جب کہ مسلمان زندگی اور موت کے سے حالات سے دوچار ہیں، اور ان کی تہذیبی بربادی کا سامان ہورہا ہے، اس طرح کے حالات میں جماعتی اور دائرتی خولوں سے بلند غلبہ دین اور احیائے اسلام کا کام کرنا بڑی سعادت کی بات ہے، جو خوش نصیب افراد ہی کو حاصل ہوسکتی ہے۔

تصوف اور اسلامی تحریکیں

تصوف اور اسلامی تحریکیں بہت اہم موضوع ہے۔ تصوف امت کا تیرہ سو سالہ سرمایہ ہے، جو قرآن وسنت ہی سے ماخوذ ہے، جب کہ اسلامی تحریکیں بھی ہمارے لئے ایک اعتبار سے سرمایہ ہیں کہ وہ دین ومذہب سے دور اور جدیدیت سے متاثر افراد کی ذہنی وعلمی تربیت کرکے، انہیں اسلام کے لئے متحرک کرتی ہیں اور فروغ اسلام کے لئے ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہیں۔

سب سے پہلے اس نکتہ کا استحضار ضروری ہے کہ زوال پذیر دور میں امت کے سارے ادارے زوال کے اثرات کی زد میں ہوتے ہیں، اس لئے کہ زوال کے ہمہ گیر وہمہ جہتی اثرات سے بچنا غیرمعمولی طور پر دشوار ہوتا ہے، یہ بات اس دور کے تصوف اور اسلامی تحریکوں پر بھی لاگو ہوتی ہے، اس وقت تصوف کے نام پر دکانداری کی روش عام ہوگئی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ حقیقی اہل اللہ بھی موجود ہیں، جو اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ اصلاح نفس کے خواہشمند افراد کی اصلاح کا فریضہ بھی سرانجام دے رہے ہیں، اسی طرح اسلامی تحریکوں میں اپنی ذاتی اصلاح کے سلسلہ میں بےفکری اور ریاستی نظام میں سیاسی اور انقلابی تبدیلی کی باتیں غالب ہوگئی ہیں۔ تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلامی تحریکوں میں کافی افراد ایسے موجود ہیں، جو ذاتی اصلاح کے سلسلہ میں خوداحتسابی سے کام لینے کے لئے کوشاں ہیں اور افرادِ معاشرہ کی اسلام سے ہمہ آہنگی کے کام کو اہم سمجھتے ہیں اور اسلامی تحریکوں میں رہتے ہوئے وہ کسی حد تک یہ کام کررہے ہیں۔

موجودہ دور میں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ تصوف اور اسلامی تحریکوں کے درمیاں پیدا شدہ دوری کو کم سے کم تر کرنے اور باہمی قربت پیدا کرنے کی کوشش ہو، لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ایک تو اہل تصوف کو عام طور پر دور جدید کے

چیلنج اور اس کی نوعیت کو سمجھنے میں دشواری درپیش ہے دوم یہ کہ اسلامی تحریکوں کے اہداف ایسے ہیں، جس میں خارجی زندگی میں جدوجہد کا کام دین کے نصب العینی کام کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، جس کی وجہ سے اس فکر سے وابستہ افراد کے لئے نفس کی ہولناک قوتوں، دل کی گہرائیوں، اللہ سے والہانہ محبت، اس کے اسرار ورموز اور انسانی شخصیت کی غیرمعمولی وسعتوں، تہذیب نفس اور تزکیہ نفس کے کام کی نوعیت کو سمجھنا مشکل ہوگیا ہے۔ نیز وہ فکری ونظریاتی اصلاح اور حاکمیت الٰہیہ کے کام سے آگے بڑھکر، اسلامی اعتبار سے دوسرے کاموں کو فیصلہ کن اہمیت دینے کے لئے تیارنہیں، ان دشواریوں کی وجہ سے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ معاشرے میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آئے، جو اہل تصوف سے اکتساب فیض کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی تحریکوں سے فکری ونظریاتی طور پر استفادہ کرے، تاکہ معاشرے کو مادیت کے ہولناک سیلاب سے بچانے کے سلسلہ میں روحانی قوتوں کے ساتھ ساتھ علمی اور فکری صلاحیتوں سے بھی بہرہ وری کی صورت پیدا ہو ،میں جس پلیٹ فارم سے یہ گفتگو کررہا ہوں، اللہ کی ذات سے کیا بعید ہے کہ یہ چھوٹا سا ادارہ اس نئے کام کا ذریعہ بن جائے۔

اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں، سب سے پہلے تصوف اور اسلامی تحریکوں کے اہداف پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے، تصوف کے اہداف یہ ہیں۔

اللہ سے اپنے تعلق کو مستحکم کرنا، اس ذات سے محبت کے ارتقائی مراحل طے کرتے رہنا، اللہ کی رضامندی کے احساس وجذبہ کا غالب سے غالب تر ہونا، آتش عشق میں جلتے رہنا، ہرسنت پرعمل پیرا ہونے کے لئے طبعی آمادگی کا ہونا، اسلامی شریعت پرعمل پیرا ہونے کا آسان ہونا، بلکہ حلاوت کا حاصل ہونا، حمیت دین کا ہونا، ظاہری اور باطنی نوعیت کے باطل سے بیزاری کا ہونا، اللہ کے سامنے جواب دہی کے احساس کا غالب ہونا، محاسبۂ نفس کے عمل کا مسلسل جاری ہونا، فکر آخرت کا غالب ہونا، عاجزی، انکساری اور اپنی ذات کی نفی کا ہونا، فقر، درویشی، دنیا واہل دنیا سے بے نیازی کا ہونا، آخرت کو کل کانہیں، آج کا مسئلہ سمجھنا، اللہ کے بندوں سے محبت کا ہونا، زندگی بھر کے معاملات کا اسلام سے ہم آہنگ ہونا، اپنی استطاعت اور صلاحیت کے تحت دعوتی کام کرتے رہنا۔

تصوف کے یہ سارے اہداف ایسے ہیں، جو اہل اللہ کی صحبت اور کثرت ذکر کے ذریعہ ہی حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی اہل اللہ کی صحبت اور کثرت ذکر ہی اصل محرک ہے، جس سے مذکورہ سارے مقاصد حاصل ہوتے ہیں، صحبت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سوا لاکھ انبیاء کرام مبعوث فرمائے، جب کہ کل کتابیں اور صحیفے ۱۰۴ ہیں، اللہ کی یہ سنت بتاتی ہے کہ انسانوں کی اصلاح کے سلسلہ میں صحبت ہی فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ کتاب سے بنیادی تعلیمات اور اصول حاصل ہوتے ہیں، جب کہ صالح اعمال کی استعداد وقوت مثالی شخصیتوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔ صحبت اہل اللہ وہ چیز ہے جو فرد کو ذکر وفکر کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔

اہل تصوف کے اہداف معلوم ہوئے، اب اسلامی تحریکوں کے اہداف پر ایک نظر ڈالیں۔

حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے جدوجہد کرنا، جدیدیت کے چیلنج کے مقابلے کے لئے کام کرنا، افراد کی فکری اور ذہنی تربیت کے لئے کوشاں ہونا، ہر طرح کے خارجی باطل کے خلاف جہاد کی حسوں کا تیز سے تیز تر ہونا، دل کے مقابلے میں ذہنی صلاحیتوں کو بیدار کرتے رہنا، اصلاح نفس کے کام کے لئے لٹریچر اور وعظ ونصیحت کی باتوں کو کافی وشافی سمجھنا، عبادت وذکر وفکر، اللہ کی محبت، سیرت سازی اور تزکیہ کے کاموں کو مقصود سمجھنے کے بجائے اسے نظام کی تبدیلی، ریاستی سطح پر اقامت دین کے کام کا ذریعہ سمجھنا ، جدید نشریاتی ذرائع، لٹریچر، اخبارات اور میڈیا سے کام لے کر غلبۂ اسلام کے لئے فضا کو ہموار کرنا، اسلام کو نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کرتے رہنا، مغربی تہذیب اور مغربی افکار سے بیزاری کی فضا پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہونا وغیرہ شامل ہے، اسلامی تحریکوں کے یہ اہداف ایسے ہیں، جس سے ایک تو اسلامی نظام فکر وعمل کی ترتیب متاثر ہوئی ہے، دوسرے یہ کہ اسلام کی اُس نصب العینی فکر میں تبدیلی واقع ہوئی ہے، جو چودہ سو سال سے سلف صالحین پیش کرتے رہے ہیں، جو نصب العینی فکر وتعلیمات ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ جسے علمائے امت اب تک پیش کرتے

رہے ہیں اسلامی فکر کی ترتیب میں تبدیلی اور خارجی زندگی میں جدوجہد کا نصب العینی کام کی حیثیت کا اختیار ہونا، یہ چیزیں ایسی ہیں، جس پر اب تک لاکھوں صفحات لکھے گئے ہیں، اس کی وجہ سے عبادت اور ذکر وفکر میں انہاک، ہولناک نفسی قوتوں کا ادراک اور ان قوتوں کو آتش عشق میں جلانے کی کوششوں کا ہونا، تصوف واہل تصوف سے دوری کا ہونا، یہ اس فکر کے لازمی اثرات ہیں، اس فکر کا ایک اثر یہ ہوا ہے کہ اسلامی تحریکوں سے وابستہ افراد میں باہم محبت کی بجائے رنجشیں، کدورتیں اور چھوٹے چھوٹے مسائل پر دوری کی خلیج پیدا ہوگئی ہے، جب باطن کی گہرائیوں میں نفسی کدورتیں موجود اور غالب ہوں گی تو کارکنوں کے باہمی تعلقات میں محض وعظ ونصیحت اور لٹریچر کے ذریعہ بہتری کی صورت پیدا ہو سکے، ممکن نہیں۔

اہل تصوف واسلامی تحریکوں کے درمیاں فہم اسلام کے سلسلہ میں فرق کی نوعیت کو سمجھنا بھی ضروری ہے، دونوں کے درمیاں ایک فرق تو یہ ہے کہ اہل تصوف، چودہ سو سالہ سلف صالحین اور علمائے ربانیین کی اسلامی فکر وتعلیمات کے تسلسل کے امین ووارث ہیں، وہ سلف کے دین کے نصب العینی تعین اور فرائض وواجبات کی ترتیب میں تغیروتبدل کے قائل نہیں، جب کہ اسلامی تحریکیں دور جدید کے کسی ایک آدھ مفکر کے فکر کا حاصل ہیں، ان کی دین کی نصب العینی تشریح، قرآن وسنت کے ان کے ذاتی مطالعہ کا حاصل ہے، حالانکہ امت کے چودہ سو سالہ فکری وعملی تسلسل کا حامل ہونا، ان کے فکر کو تھامے رہنا، یہ دراصل **اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم** کی قرآنی تعلیمات پر گامزن ہونا ہے، امت کے علمائے ربانیین کے تسلسل کے مقابلے میں ایک آدھ مفکر کی سوچ میں غلطی کا بہت زیادہ احتمال ممکن ہے، جب کہ ربانی علماء کی عظیم اکثریت کا اتفاق لگ بھگ اجماع امت کے مترادف ہے۔

ان دونوں کے درمیاں دوسرا فرق یہ ہے کہ اہل تصوف کام کا آغاز فرد کے پانچ فوٹ جسم سے کرتے ہیں اور فرد کی تہذیب نفس، تزکیہ نفس اور اصلاح نفس سے کرتے ہیں اور نفس کی حیوانی وجبلی قوتوں کو مطیع کرنے کے کام کو سارے کاموں پر ترجیح دیتے ہیں، دوسرے اور تیسرے مرحلہ میں آ کر وہ اپنے ساتھ وابستہ افراد کو افرادِ معاشرہ کی اصلاح کے کام پر لگاتے ہیں، جب کہ اسلامی تحریکوں کا آغاز ہی حکومت الٰہیہ کے قیام کی جدوجہد سے ہوتا ہے، ان تحریکوں کی شروعات بھی اس کام سے ہوتی ہے تو انتہا بھی اسی کام پر ہوتی ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ جدید اسلامی تحریکیں ہمارا سرمایہ ہیں، اس سرمایہ کا تحفظ، اس کی بقا، اس کا فروغ ہمارا اپنا کام ہے اور اس سے ملت کی ارتقا کا کام وابستہ ہے، لیکن اس سرمایہ کے تحفظ کے سلسلہ میں بعض رکاوٹیں ایسی ہیں، جن کے فہم کی صورت کا پیدا ہونا دشوار ہوگیا ہے، ان رکاوٹوں میں ایک بڑی رکاوٹ نفسی قوتوں کی کارفرمائی، ان کی مکر وفریب کی وارداتوں اور نفس کی ہولناک قوتوں کے فہم کی کمی ہے، اسلامی تحریکوں سے ایک بڑی لغزش جو ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے یہاں تہذیب نفس، تزکیہ نفس اور اصلاح نفس کا کام ذیلی نوعیت کی صورت اختیار کر گیا ہے، جس کی وجہ سے نفس کی قابل ذکر حد تک اصلاح کی صورت پیدا نہیں ہو پاتی اور ان تحریکوں سے وابستہ افراد کے نفسی مسائل ایسی صورت اختیار کرتے ہیں، جس سے ان تحریکوں سے وابستہ افراد میں ٹوٹ پھوٹ، باہمی رنجشوں اور ایک دوسرے کے درمیاں کدورتوں کی صورت پیدا ہوجاتی ہے، اس طرح کارکنوں کے نفسی مسائل تحریکوں کی ارتقا کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اور تحریکیں داخلی نوعیت کے انتشار کا شکار رہتی ہے۔

اہل تصوف کا کہنا ہے کہ تہذیب نفس اور تزکیہ نفس کا کام ایسا ہے، جو سب سے زیادہ دشوار تر کام ہے، یہ کام دین کے مقاصد میں شامل ہے۔ **هوالذى بعث فى الامين رسولا منهم يتلوا عليهم اياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة** کی قرآنی آیت جو قرآن میں چار مختلف مقامات پر آئی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کے بعثت کے مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ ایک ممتاز عالم اور عارف اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں۔

''قرآن میں رسول اللہ ﷺ کے چار مقاصد بیان فرمائے گئے ہیں۔ (۱) آیات پڑھ کر سنانا (۲) تزکیہ کرنا یعنی کفر، شرک، بدعملی وبداخلاقی اور امور جاہلیت سے ان کو پاک وصاف کرنا (۳) کتاب اللہ کے احکام کی تعلیم دینا اور اس کے مضامین کی تشریح کرنا (۴) حکمت ودانائی، احکام کے اغراض اور شریعت کے اصول ومقاصد کی تعلیم دینا۔

تزکیہ سے مراد عقائد ونظریات اور اعمال واخلاق کی پاکیزگی ہے، قرآن کریم نے تین مقامات پر تزکیہ کو ''تعلیم'' سے مقدم ذکر فرمایا ہے جس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ بقدر ضرورت تزکیہ تعلیم سے پہلے ہونا چاہئے، تعلیم اسی وقت مفید اور بارآور ہوسکتی ہے، جب کہ قلوب میں اس کے قبول کرنے کی اہلیت اور جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہو، یہ تزکیہ حضرت خاتم الانبیاءﷺ کے فیضان صحبت اور مکارم اخلاق سے حاصل ہوتا تھا اور اب بھی بقدر استعداد اللہ کے مقبول بندوں سے ربط وتعلق اور ان کی صحبت ومجالست سے حاصل ہوسکتا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ تعلیم کتاب وحکمت سے بھی اصل مقصود تزکیہ ہے، یہ نہ ہو تو ساری تعلیم بیکار ہے، اعمال واخلاق کے بغیر نرے علوم ومعارف کی حق تعالیٰ کے یہاں کوئی قدر نہیں، آدمی ساری دنیا کی کتابیں چاٹ لے، لیکن اگر انسانی اخلاق اور ایمانی اعمال نہیں تو پڑھا لکھا جانور تو ہوسکتا ہے مگر انساں کہلانے کا مستحق نہیں، تزکیہ کے بغیر نہ ایمان کے رسوخ کی کیفیت اور یقین واطمینان کی قوت پیدا ہوگی اور نہ اخلاق درست ہوسکیں گے، نہ اخلاص کی دولت ملے گی اور نہ اعمال پر مداومت نصیب ہوگی، (حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی تحریر کا اقتباس) دوسری چیز جس کی کمی نے اسلامی تحریکوں میں تحرک وفعالیت، خود احتسابی، مادیت پرستی کے سیلاب میں خود اعتمادی اور کامل یقین کے ساتھ دعوتی کام کرکے، آگے بڑھنے اور اپنے لئے راہیں نکالنے میں دشواری پیدا کی ہے، وہ دل کی صلاحیتوں کے فہم اور اس کی بیداری کے کام کو ذیلی اہمیت دینا ہے، جب کہ اس کے مقابلہ میں سارا زور عقل وعقلیت اور استدلال پر ہے، دل جن چیزوں سے بیدار ہوکر محبت، معرفت، تقویٰ، خشیت اور اللہ سے مستحکم تعلق کی راہ پر گامزن ہوتا ہے، وہ عبادات اور ذکر وفکر کے مجاہدے ہیں، ان کو بھی مطلوبہ اہمیت نہ دینا ہے۔

اہل تصوف کا کہنا ہے کہ دل کی صلاحیتوں کی بیداری وارتقا سے وہ استعداد پیدا ہوتی ہے، جس سے فرد وافراد کی یقین کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے، اللہ کی ذات پر اعتماد بڑھ جاتا ہے، وہ ہر طرح کے حالات میں غلبۂ اسلام کے لئے جان فروشی سے آگے بڑھنے اور ہر طرح کے باطل سے مقابلہ کی استعداد سے بہرہ ور ہوجاتے ہیں۔

قرآن، تقویٰ، محبت، معرفت، ایمان ویقین اور انوار وغیرہ کا مرکز دل کو قرار دیتا ہے۔

''ومن یومن باالله یهد قلبه'' (جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اللہ اس کے قلب کو ہدایت سے سرفراز فرماتا ہے)۔

''اولئک الذین المتحن الله قلوبهم للتقویٰ'' (اور اللہ نے ان کے دل تقویٰ کے لئے آزمالئے ہیں)۔

''فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور'' (آنکھیں اندھی نہیں ہوتی بلکہ سینے میں جو دل ہیں وہ اندھی ہوتی ہیں)۔

میں اس بات کو پھر دہراتا ہوں کہ اسلامی تحریکیں ہمارا سرمایہ ہیں، اس لئے کہ دور جدید میں علوم وفنوں نے جو صورت اختیار کی ہے، مادیت پرستی اور سیکولرزم کی تیزی سے بڑھتی ہوئی فضا نے مسلم معاشرے کو جس طرح مسموم کیا ہے اور جدید مادی نظریات اور تہذیب جدید نے جس طرح مسلم ملت کے کروڑہا افراد کو جدیدیت کے طوفان میں زیروزبر کردیا ہے، اسلامی تحریکوں کے ہاں لٹریچر، فکری قوت، جدید نوعیت کے استدلال کا سلیقہ، افراد کار اور وسائل موجود ہیں، جو جدیدیت کے اس سیلاب کے مقابلہ میں مؤثر ہتھیار کی حیثیت رکھتے ہیں، اسلامی تحریکوں کے اس کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اسلام کو نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کرکے، اسلام کے کامل دین کے تصور کو اجاگر کیا ہے، موجودہ دور میں جب کہ سارے مذاہب عملی اجتماعی زندگی میں انسانیت کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں، نیز عالمی سرمایہ دار مذاہب کو پوجاپاٹ تک محدود رکھنے کے لئے بھی کوشاں ہے، تاکہ وہ انسانیت کو اپنے سرمایہ پرستی کے مفادات کے لئے استعمال کرسکے، ان حالات میں اسلامی تحریکوں کی طرف سے اسلام کو نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کرنے کے لئے لاکھوں صفحات کا لٹریچر تیار کرنا بڑا کارنامہ ہے، جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن محبت ومعرفت کی کمی، نفسی قوتوں کو آتش عشق میں جلانے کے کام سے بے نیازی، باہم ایک دوسرے سے مشفقانہ ومحبانہ تعلقات کے فقدان اور دل کی صلاحیتوں جیسے کاموں کو ثانوی اہمیت دینے کی وجہ سے اسلامی

تحریکوں میں مادیت کے اس سیلاب سے مقابلہ کے لئے فعالیت وتحرک میں غیر معمولی کمی واقع ہوئی ہے، اس سلسلہ میں اہل تصوف سے استفادہ کئے بغیر چارہ کار نہیں ہے، اس لئے کہ سارے کاموں میں بہتری، پاکیزگی، للّٰہیت اور اخلاص وغیرہ، اہل اخلاص اور اہل محبت کی صحبت سے ہی حاصل ہوتا ہے، ملت کی ساری تاریخ اس تسلسل کا حصہ ہے۔

جدید طبقات کے لئے جدید اسلامی تحریکیں ایک اعتبار سے پرائمری نوعیت کی ہیں کہ وہ ان کو جدیدیت کے مسموم اثرات سے بچا کر، اسلام کے دروازے پر لاکھڑا کردیتی ہیں، وہ ان کی ذہنی اورعقلی تربیت کرنے میں تو کامیاب ہوتی ہیں، لیکن تزکیہ نفس اور تہذیب نفس کے سلسلہ میں ان کے ہاں نظام کار موجود نہیں، جس کی وجہ سے وہ عام طور پر زندگی بھر تزکیہ کے معاملہ میں پیش قدمی نہیں کرنے پاتے، اور سیرت وکردار میں پاکیزگی وبلندی پیدا نہیں ہوپاتی، عقل وعقلیت کے ساتھ دل کے وافر خزانوں میں سے کچھ حصہ ہونا ضروری ہے، اس کی صورت یہی ہے کہ اہل اللہ کے بارے میں شکوک وشبہات کا خاتمہ ہو اور ان سے استفادہ فیض کی صورت پیدا ہو، اس سے دل اورعقل کے درمیاں توازن کی صورت پیدا ہوگی اور غلبہ اسلام کے لئے جدوجہد میں کئی گنا اضافہ ہوگا، اس نکتہ کا استحضار بھی ضروری ہے کہ نفس ایک ایسا بت خانہ ہے، جس کا ادراک عقل وعقلیت کے ذریعہ نہیں ہوسکتا، اس کے لئے دل کی صلاحیتوں کی بیداری کی ضرورت ہے، دوسری صورت میں نفس کے بت خانے کے ٹوٹ پھوٹ کا عمل دشوار تر ہوتا ہے اور فرد وافراد زندگی بھر ایمان کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے میں بمشکل ہی کامیاب ہوتے ہیں۔

قالت الاعراب امنا قل لن تؤمنوا ولکن قولو اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم (یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ ہم نے اسلام قبول کیا ہے، ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔)

قرآن میں ایک جگہ دنیا میں دوطرح کے افراد کی نشاندہی فرمائی گئی ہے، ایک حالت ایماں میں رہنے والے دوسرے حالت تاریکی میں۔

اومن کان میتاً فاحییناہ وجعلنا لہ نوراً یمشی بھا فی الناس کمثلہ فی الظلمات لیس بخارج منھا (کیا جوشخص مردہ تھا ہم نے اسے زندہ کیا اور اسے نورعطا کیا جس میں وہ چلتا پھرتا ہے کیا وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو اندھیریوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔)

ایمان کا نور بہت بڑی نعمت ہے، بلکہ دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے، کلمہ گو فرد کو یہ نور حاصل ہے، لیکن جس طرح زیرو کے بلب اور ہزار وولٹ کے بلب کی روشنی میں فرق ہے، اسی طرح ایمان کی کمزور حالت اور طاقتور ایمان کی حالت کے درمیاں بنیادی فرق ہے، اسلام کو ایسا ایمان مطلوب ہے، جس میں فرد زندگی بھر کے معاملات میں نفس کے حالات کا مشاہدہ کرسکے اور محاسبہ نفس کے ذریعہ حُب جاہ، حُب مال، حرص وہوس، جذبہ شہرت اور دوسروں کی تحقیر جیسی باطنی برائی کا قلعہ قمع کرسکے۔

اس نور کی علامتوں میں کچھ علامتیں یہ ہیں، سینہ کا کشادہ ہونا، آخرت میں اللہ سے ملاقات کے استحضار کا ہونا، محبت ومعرفت کی ارتقائی حالتوں کا ہونا، اسلامی شریعت کا محبوب تر ہونا، عجز انکساری اور اپنی ذات کی نفی کا ہونا، دولت ودنیا سے بے نیازی کا ہونا، صبر وشکر کی نفسیات کا غالب ہونا، توکل کا ہونا، خوف وامید کی درمیانی حالت میں رہنا، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں کے لئے یکسو ہوجانا، اللہ کے ذکر سے طبعی مناسبت کا ہونا، دینی حمیت کا حامل ہونا، وغیرہ شامل ہے۔

غلبۂ دین کے کام میں پیش قدمی اور افراد معاشرہ کی اس کام کے لئے ذہنی ودلی ہم آہنگی کی صورت، طاقتور ایمان، دل کی صلاحیتوں کی بیداری اور نور ایمان کے ذریعہ ہوسکتی ہے، جب تک فرد کی شخصیت میں نفس کا بت کدہ موجودہ ہے، اس وقت تک طاقتور ایمان کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی، طاقتور ایمان کے بغیر زبان سے تو اسلام جاری رہتا ہے، لیکن دل غیراللہ میں مصروف رہتا ہے اور اپنے اسلام پر ناز پیدا ہونے لگتا ہے اور دوسروں کی اسلامی فکر اور اسلامی حالت مشکوک نظر آنے لگتی ہے، اس صورتحال کی تبدیلی کے بغیر معاشرے اور ریاستی سطح پر غلبۂ اسلام کا کام ہونے کے بجائے غلبہ اسلام کی تحریک کمزور سے کمزور تر ہوکر، بالآخر تحلیل ہوجائے گی اور اس سے وابستہ افراد اس ادراک سے ہی محروم ہوں گے کہ یہ سب کچھ کیوں ہورہا ہے، نیز ہماری ساری کاوشوں کے باوجود معاشرہ ہمارا ساتھ دینے کے لئے کیوں تیار نہیں ہے، اسلامی تحریک دراصل عقل وعقلیت کے ساتھ ساتھ طاقتور ایمان ویقین

اور اللہ کی محبت سے سرشار تحریک ہوتی ہے، اسلامی تحریک سے وابستہ افراد کے لئے اس آخری نکتہ کا ادراک وشعور ہونا ازحد ضروری ہے، اسی سے اس کی ساری ترقی وارتقا وابستہ ہے، سارے تالے ایمان ویقین کی مضبوطی اور اللہ سے والہانہ محبت کے ذریعہ ہی کھل سکتے ہیں، ماضی کی ساری اسلامی تحریکوں کی فعالیت وکامیابی کا اصل محرک طاقت یہی رہی ہے۔

سلیقہ انسانیت پیدا ہونے کے سلسلہ میں

ذکر وفکر کے حلقوں کا کردار

زیر نظر تین مضامیں ذکر کے ہفتہ وار مجلس کے لئے لکھے گئے تھے، ان مضامیں میں ذکر ومراقبہ کی اہمیت اجاگر کرنے اور زندگی کو بدلنے کے سلسلہ میں ذکر ومراقبہ کے کردار پر گفتگو کی گئی ہے، ذکر کے ملکہ کا رسوخ عام طور پر ذکر کے حلقوں میں شرکت اور اہل اللہ سے تعلق کے استحکام کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔

ذکر وفکر کی ایک بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس سے اللہ سے تعلق استوار ہوتا ہے اور حمیت دین پیدا ہوتی ہے، ذکر وفکر کی اس اہمیت کے پیش نظر ذکر پر لکھے گئے یہ تینوں مضامین کتاب میں شامل کئے جارہے ہیں۔

اسم ذات کے قلبی ذکر (جسے اصطلاح میں مراقبہ بھی کہتے ہیں)۔ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ نے اسم ذات کو اسم اعظم بھی کہا ہے، اسم اعظم کے اس قلبی ذکر سے سعادتوں کی وہ چابی حاصل ہوجاتی ہے، جس سے باطن کے سارے قفل کھل جاتے ہیں اور زندگی کے مشکل سے مشکل معاملات کے حل کی صورتیں پیدا ہوجاتی ہیں، اس لئے کہ کائنات کی مرکز ہستی اللہ کی ذات ہے، ساری کائنات اور کائنات میں موجود سارا حسن اور سارے انوار اس ہستی کے اسم ذات سے ہی وابستہ ہیں، چنانچہ فرمایا گیا کہ دنیا میں جب ایک فرد بھی اللہ اللہ کرنے والا موجود نہ ہوگا تو کائنات کا بستر گول کردیا جائے گا۔

اگر مراقبہ کے فوائد وثمرات اور اس کی برکات پر ایک نظر ڈالیں تو آپ محسوس کریں گے کہ مراقبہ کے یہ فوائد وثمرات ایسے ہیں کہ جسم وجان کی ساری توانائیاں خرچ کرکے بھی اگر اسم ذات کے ذکر کا ملکہ راسخ ہوتو سستا سودا ہے نیز مراقبہ آپ کے لئے مشکل ہونے کی بجائے آسان تر ہوجائے گا۔ ان فوائد وثمرات کی اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) اللہ کی ذات سے تعلق مستحکم سے مستحکم تر ہوتا جائے گا۔ (۲) نفس کے دیو کو مفتوح کرنے میں انشاء اللہ کامیابی حاصل ہوجائیگی۔ (۳) ہر طرح کے ذہنی انتشار وخلفشار سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی جائے گی۔ (۴) بڑی سی بڑی مصیبت اور آفت کے وقت فرد کا سکون واطمینان قائم وبرقرار رہے گا۔ (۵) نماز میں رفتہ رفتہ خشوع وخضوع کی کیفیت حاصل ہوتی جائیگی۔(۶) انسانیت کا حقیقی درد اور انسانی جوہر پیدا ہوتے جائیں گے۔ (۷) ہر نیکی پر عمل کرنے میں آسانی پیدا ہوتی جائے گی اور ہر بُرائی سے بچاؤ کی صورت بھی۔ (۸) ذہن میں ہر معاملہ کے منفی پہلو کی بجائے مثبت پہلو غالب سے غالب تر ہوتا جائے گا۔ (۹) زبان کی آفتوں اور مصیبتوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوگی اور ضرورت سے زائد گفتگو سے اذیت حاصل ہوگی۔ (۱۰) حب جاہ وحب مال کے جذبات واحساسات پامال اور کمزور تر ہوتے جائیں گے۔

(۱۱) انانیت، بڑے پن اور دوسروں کی تحقیر کے بت ٹوٹ پھوٹ جائیں گے اور عاجزی اور انکساری پیدا ہوتی جائے گی، اپنے آپ کو کچھ سمجھنے کا احساس کمزور سے کمزور تر ہوتا جائے گا۔ (۱۲) قلبی سکون کی دولت عظمیٰ حاصل ہوگی، جس کے مقابلے میں ساری دنیا کی دولت بھی ہیچ محسوس ہوگی۔ (۱۳) اللہ سے مانگنے کی نفسیات پختہ سے پختہ تر ہوگی۔ (۱۴) صبر وشکر کے احساسات مستحکم ہوں گے۔ (۱۵) فرد، عزیز واقارب اور دوست واحباب کے لئے باعث زحمت بننے کی بجائے باعث خیر وبرکت ثابت ہوگا۔ (۱۶) وقت کے صحیح استعمال کی صلاحیت پیدا ہوگی اور ایک ایک لمحہ کی قدروقیمت کی استعداد پیدا ہوگی۔ (۱۷) تقویٰ جیسی نعمت عظمیٰ حاصل ہوتی جائے گی، یعنی تقویٰ میں ارتقا کی حالت پیدا ہوگی۔ (۱۸) اللہ کی شان عظمت کا غلبہ حاصل ہوگا (۱۹) اللہ کی نعمتوں کی شکر ادائیگی کا میلان غالب ہوگا۔ (۲۰) آخرت کی زندگی کــــــــل کی زندگی محسوس ہوگی، اس لئے اس کی تیاری کی سب سے زیادہ فکرمندی پیدا ہوگی۔

(۲۱) دنیاوی آسائشوں اور دولت کے حصول کی جدوجہد میں توازن پیدا ہوگا۔ (۲۲) ہر سنت پر عمل پیرا ہونے کا رجحان غالب تر ہوتا جائے گا۔ (۲۳) زندگی کے مسائل، مشکلات اور پریشانیوں کے سلسلے میں حساسیت میں غیرمعمولی کمی واقع ہوگی۔ (۲۴) اللہ کی معیت اور اس کی دوستی حاصل ہوگی۔ (۲۵) اسلامی شریعت پر عمل کرنا، لذت کا مسئلہ بن جائے گا۔

(۲۶) کاروبار اور ملازمت کے دوران مزاج کے خلاف پیش آنے والے واقعات وحالات کے وقت احساس شدت میں اعتدال پیدا ہوگا، افراد کے ساتھ رویے میں بہتری، ترقی بلکہ محبت پیدا ہوگی۔ (۲۷) اللہ کی ذات پر یقین میں اضافہ پر اضافہ حاصل ہوگا۔ (۲۸) نفس کی ہولناک قوتوں کی معرفت حاصل ہوگی، جس سے نفس کی مکر وفریب کی ہزارہا وارداتوں سے آشنائی بھی حاصل ہوگی تو اس سے بچاؤ کی صورت بھی پیدا ہوتی جائے گی۔ (۲۹) مزاج میں توازن، ٹھہراؤ اور اعتدال پیدا ہوگا اور زندگی کے ہر موڑ پر اس اعتدال کا مظاہرہ ہوگا۔(۳۰) بحرانوں سے نکلنے کے سلسلہ میں اللہ کی مددونصرت حاصل ہوگی۔

(۳۱) خوداعتمادی سے سرشاری حاصل ہوگی۔ (۳۲) علم، فراست، بصیرت، قوت ارادی وقوت کارکردگی میں اضافہ ہوگا۔ (۳۳) اللہ کے انوار کو اخذ کرنے اور اس کے حسن وجمال سے بہرہ وری کی صورت پیدا ہوگی۔ (۳۴) روحانی توانائی، جسمانی توانائی، ذہنی ووجدانی غرض کہ ہر طرح کی توانائی حاصل ہوگی۔ (۳۵) تجدید ایمان کی بہتر اور مؤثر صورت پیدا ہوگی۔ (۳۶) بہت ساری جسمانی بیماریوں سے بچاؤ، بالخصوص ذہن اور دل کے زیر وزبر ہونے سے پیدا ہونے والی بیماریوں اور شگر اور بلڈ پریشر تک کی بیماریوں میں مراقبہ مفیدوکارآمد ہے، اس لئے کہ اس سے ذہنی خلفشار ختم ہوتا ہے اور دل کی رفتار میں توازن پیدا ہوتا ہے۔ (۳۷) مراقبہ، جملہ روحانی بیماریوں کے ازالے اور نفس کے درندے کو مطیع کرکے، اسے اللہ ورسول کی اطاعت میں دیدینے کا موجب ہے۔ (۳۸)مراقبہ، گھر کے ماحول کو خوشگوار بنانے، افراد خانہ کو خوشی ومسرت سے سرشار کرنے اور باہم محبت پیدا کرنے کا موجب ہے۔ (۳۹) مراقبہ فرد کے قلب کو قلب سلیم اور اس کے نفس کو نفس مطمئنہ تک پہنچا دیتا ہے۔

(۴۰) مراقبہ، دنیا اور دنیا کے مستقبل کے حوالے سے پیدا ہونے والے احساسات کی شدت کو ختم کرکے، ان میں پاکیزگی پیدا کرتا ہے اور یہ احساس غالب کردیتا ہے کہ مال واولاد اور جسم وجان سب اللہ کی مِلک ہے، اللہ اپنی مِلک میں ہر طرح کا تصرف کرسکتا ہے، جب سب کچھ اس کا ہے تو ان چیزوں کے بارے میں میری بیجا تشویش وبے قراری عبث ہے۔

(۴۱) اللہ کی ہستی میں جو صفات وخصوصیات موجود ہیں، بندہ اسم ذات کے تکرار ذکر سے ان خصوصیات کے کچھ اجزا اخذ کر لیتا ہے، جس سے فرد کی شخصیت میں نکھار اور کردار

میں رونق پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ **تخلقوا باخلاق اللہ** (اللہ کے اخلاق اختیار کرو)۔

(۴۲) توحید کا رنگ غالب ہوگا، جس سے قولی توحید، حقیقی توحید کی صورت اختیار کرنے لگتی ہے اور فرد دوئی ودورنگی سے محفوظ ہوجاتا ہے۔

(۴۳) شخصیت پر اسلامی شریعت کا تقدس نقش اور ثبت ہوجاتا ہے، بالخصوص معاشرت ومعاملات کے سلسلہ میں حساسیت اور دینی حمیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

(۴۴) مراقبہ حاصل اپنی ہستی کا مٹ جانا اور اللہ کی ہستی کا باقی رہنا ہے، یعنی اللہ کے ساتھ باقی رہنا ہے۔ جب تک اسم ذات کے کثرت ذکر کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی یہ حالت مستحکم نہیں ہوتی، تب تک مجاہدوں کا یہ عمل جاری رہے گا، جب ہستی کی فنا کا یہ عمل تکمیل پذیر ہوگا، اس کے بعد مزید ترقی نماز اور تلاوت قرآن سے حاصل ہوگی۔

مراقبہ کے یہ اور اس طرح کے سارے فوائد مراقبہ کے ملکہ کو راسخ کرنے کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوں گے اور یہ مراقبہ صاحب دل اور مراقبہ پر غیرمعمولی مجاہدوں کی حامل شخصیت کی صحبت اور اس سے محبت کے نتیجہ میں ہی حاصل ہوگا۔

جس مراقبہ کے یہ اور اس طرح کے بہت سارے فوائد وثمرات حاصل ہوں، وہ مراقبہ آپ کی ہمت وحوصلہ سے ہی وابستہ ہے اور حوصلہ وہمت سے ہی اس راہ میں حائل رکاوٹیں آہستہ آہستہ دور ہوسکتی ہیں۔

موجود دور کی بُرائیاں جس نے انسانیت کو ہمہ گیر فساد سے دوچار کر دیا ہے، ان میں حب جاہ، حب مال، حرص وہوس، ذہنی دباؤ، انسانیت آزاری، دولت کی خاطر انسانیت کی پامالی، مادی مسائل ومشکلات کی وجہ سے لگ بھگ ہر گھر کا ماتم کدہ میں تبدیل ہوجانے، دنیاوی مستقبل کی فکرمندی کے غالب ہونے، دوسروں کو زیر کرنے کے احساسات وحرکتوں کے ہونے وغیرہ کی ساری بُرائیاں شامل ہیں، ان سب سے بچاؤ کے لئے مراقبہ آپ کے لئے ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو مراقبہ دنیا وآخرت کی جملہ سعادتوں کا ذریعہ ہو، آپ اس نعمت سے محروم ہوکر، اپنے آپ کو ہر وقت کی اذیت، جھنجھلاہٹ، اشتعال، اداسی، غیریقینی حالت اور شدید اضطراب ہی سے دوچار کریں گے، اس لئے اپنے اوپر رحم کھاتے ہوئے اللہ کے اسم ذات کے سایے میں پناہ لیں، اس سے آپ کی زندگی جنت کا منظر بن جائے گی۔

مراقبہ کے ذریعہ آپ اپنی اولاد کو بھی دنیا وآخرت کے جہنم کے انگاروں سے بچانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں اور ان کو بھی اس راہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔

اللہ نے واضح طور پر فرمایا دیا ہے۔ **فَوَيۡلٌ لِّلۡقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن ذِكۡرِ اللَّهِ** (ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دل اللہ کے ذکر کے لئے سخت ہیں، یعنی اس کے ذکر کی طرف آنے کے لئے تیار ہی نہیں)۔

ہلاکت کی اصل صورت تو آخرت میں ظاہر ہوگی، لیکن اس دنیا میں بھی ہلاکت کے آثار واضح طور پر نظر آتے ہیں کہ شخصیت اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے، حقیقی سکون کی دولت سے محرومی ہوتی ہے اور فرد نہ ختم ہونے والے مسائل ومشکلات سے دوچار ہوتا ہے، نیز قناعت کی نعمت سلب ہوجاتی ہے۔

(۲)

ذکر ومراقبہ ایسی چیز ہے، جو دل، روح اور انسانی شخصیت کی ناگزیرضرورت ہے، ایسی ضرورت کہ فرد کچھ دنوں کے لئے کھانے کے بغیر تو زندہ رہ سکتا ہے، لیکن ذکر ومراقبہ کے بغیر دل وروح کی ایک طرح سے موت واقع ہوجاتی ہے، اس کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ صحیح سمت میں فرد کی سوچ منجمد ہوجاتی ہے، دل وروح کا اشتعال فرد کو انسانی سطح سے گرا کر، حیوانی سطح پر لے آتا ہے، فرد سے اعتدال وتوازن رخصت ہوجاتا ہے، اہل خانہ ، دوست احباب، دفتری وکاروباری ساتھیوں سے جھگڑے وتصادم کی فضا غالب ہوجاتی ہے، مادی حسن پر ٹوٹ پڑنے کی ادائیں فرد کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہیں۔

قرآن نے انسان کی پیدائش کا مقصد عبادت بتایا ہے **وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡإِنسَ إِلَّا لِيَعۡبُدُونِ** ذکر ومراقبہ عبادت کا ایک بڑا حصہ ہے، یا یوں کہیں کہ عبادت کی روح ہی ذکر ومراقبہ ہے۔ ذکر ومراقبہ سے انسانی شخصیت میں اللہ سے عشق کی رَو دوڑ جاتی ہے، جس سے عبادت واطاعت آسان ہوجاتی ہے، ہم نے اپنی زندگی میں معاش کو جو اہمیت دی ہے کہ ہماری ساری توانائیاں اسی میں خرچ ہورہی ہیں، اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم ذکر و مراقبہ کی لذت سے آشنا نہیں۔

ذکر ، فرد کو آدابِ انسانیت اور سلیقہ انسانیت سے جس طرح آشنا کرتا ہے اور معاشی

خوشحالی کی فکر کو جس طرح حداعتدال میں رکھتا ہے، ذکر سے محرومی کی وجہ سے فرد دنیا پر مجنون وار ہو کر گرتا ہے، اور ان ساری خرابیوں اور سرگرمیوں میں مبتلا ہوتا ہے، جو انسانی وقار کے سراسر منافی ہیں۔

اگر ہم نے ذکر ومراقبہ کو اہمیت نہ دی تو ہم مادیت کی دلدل میں اس طرح پھنستے جائیں گے کہ اس سے نکل کر آداب انسانیت سے کسی بھی طور بہرہ ور نہ ہوسکیں گے، لوٹ مار ، رشوت، انسان آزاری، دولت کے ڈھیر جمع کرنے کا جنون اور باطنی بیماریاں ہمیں اس طرح گھیر لیں گی کہ معاشرے میں کہرام برپا ہوگا اور اصل جہنم سے پہلے خود یہ زندگی ہمارے لئے جہنم کانمونہ بن جائے گی۔

ہم ذکر ومراقبہ سے فرار کے ہزارہا راستے اور بہانے تلاش کرتے ہیں، سبب یہ ہے کہ جس معاشرے میں ہماری نشوونما ہوئی ہے، وہ مادیت پرستی اور نفس پرستی کا معاشرہ ہے، جس میں دل اور روح کی صدائیں سنائی نہیں دیتی، ہر طرف خوشحال معاشی زندگی کے مناظر ومظاہر ہیں، جو ہمیں شب وروز دنیاوی مستقبل کی بہتری کے حوالے سے سوچنے پر مجبور کر رہی ہیں۔

جب تک دنیا پر فریفتگی اور دنیا کے چند دنوں کے مستقبل کی گہری منصوبہ بندی کے جنوں سے ہم نہیں نکلیں گے، اس وقت تک نہ تو مراقبہ ہمارے لئے آسان ہوسکتا ہے، اور نہ ہی ذکر ومراقبہ کے لئے آمادگی ہوسکتی ہے۔ ذکر ومراقبہ کے لئے ہم نے اپنے اندر جو حجابات پیدا کرلئے ہیں، وہ حجابات دور کئے بغیر اس راہ میں پیش قومی مشکل ہے، ذکر ومراقبہ کی راہ میں جو رکاوٹیں درپیش ہیں، انہیں اس طرح شمار کیا جا سکتا ہے۔

(۱) زیادہ عرصہ تک اس سے غفلت وسستی کے مظاہرہ کا ہونا ۔ (۲) ذکر ومراقبہ کی اہمیت اور اس کے غیر معمولی فوائد وبرکات اور زندگی کو بدلنے اور حلاوت سے سرشار کرنے کے سلسلہ میں اس کے کردار سے ناآشنا ہونا۔ (۳) مادی مصروفیات کو مسلط کرنے کی وجہ سے ذکر ومراقبہ کے لئے وقت نکالنے میں دشواری کا ہونا۔ (۴) فطرت سلیمہ کو مسخ کرنے اور اسلامی شریعت کے خلاف بعض اعمال کا عادت کا حصہ ہونے کی حماقتوں کا ہونا۔ (۵) ذکر ومراقبہ کی طلب کا نہ ہونا یا طلب کا ختم ہونا۔ (۶) ذکر ومراقبہ سے عدم مناسبت رکھنے والے افراد سے دوستانہ مراسم کا ہونا۔ (۷) اہل اللہ کی صحبت کو غیر ضروری سمجھنا، بلکہ ان سے کدورت ودوری کا ہونا۔ (۸) اللہ سے محبت کے میلانات کا نہ ہونا۔ (۹) دین ومذہب کو بعض مراسم کی ادائیگی تک محدود سمجھنا۔ (۱۰) دین کی سیاسی یا دعوتی تشریح کو حرف آخر سمجھنا یا اسے نصب العینی اہمیت دینا۔ (۱۱) ذکر ومراقبہ کے ماحول سے جڑنے سے ناکامی کا ہونا۔ (۱۲) زندگی کی ساری مشکلات واذیتوں اور مسائل کی تپش کے باوجود اللہ کی طرف راغب ہونے کے شوق کا نہ ہونا یا برائے نام ہونا۔ (۱۳)دین کے دعوتی کاموں میں اسلام اور امت کے مسائل سے بے حسی کا مظاہرہ ہونا، جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جسے مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی نہیں، وہ ہم میں سے نہیں۔ (۱۴)ضمیر کی پکار پر لبیک کہنے سے انکار کرنا ، جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ زندگی کے ہر معاملہ میں دل کی فتویٰ کی صلاحیت مضمحل ہوجاتی ہے۔(۱۵) اللہ کی غریب اور پسی ہوئی مخلوق کو اس کی حالت زار پر چھوڑنے اور کسی بھی سطح پر اس کی مدد نہ کرنا اور ملت کی بے شمار ضروریات سے بے نیازی کا ہونا۔ (۱۶) ضد، اشتعال اور حب جاہ وحب مال اور حسد وجلن کی نفسیات کا غالب ہونا۔ (۱۷) نرمی کی صفت سے محروم ہونا (۱۸) آخرت کی ابدالاباد والی زندگی کو فراموش کرنا اور اسے قابل ذکر اہمیت نہ دینا۔ (۱۹) چھوٹے چھوٹے معاملات کی وجہ سے عزیز واقارب اور دوست واحباب سے تعلقات کو بگاڑنے کے مزاج کا حامل ہونا۔ (۲۰) جدیدیت کی فکری لہروں سے بُری طرح متاثر ہونا۔ (۲۱) سلف صالحین کی اسلامی فکر پر عدم اعتماد کا ہونا اور اپنی خود ساختہ اسلامی فکر کو حتمی سمجھنا۔ (۲۲) غیرمعمولی ذہانت کی وجہ سے نفس کی یرغمالی کا ہونا۔ (۲۳) اپنے علم کو بڑا سمجھنا اور اس پر غرور کا ہونا۔ (۲۴) ذکروفکر کے نام پر محض پیر پرستی کا ہونا، اور اعمال اور مجاہدوں کے بجائے پیر کو نجات کا ذریعہ سمجھنا ۔ (۲۵) عامل نما بزرگوں کے عملیات پر زندگی بھر انحصار کا ہونا، ان عملیات کی وجہ سے محض کیفیات ہی کو سب کچھ سمجھنا ۔(۲۶) ذکر کی راہ پر مستقل مزاجی سے چلنے میں کوتاہی کا واقع ہونا اور گرنے کے بعد اٹھنے کا نام نہ لینا اور حوصلہ کا مظاہرہ نہ ہونا۔

جہاں ان اسباب میں سے کچھ اسباب بھی موجود ہوں گے، وہاں ذکر وفکر اور مراقبہ کی راہ مسدود ہوگی، اور فرد و افراد داخلی، وجدانی، ذہنی اور نفسیاتی طور پر سنگین مسائل سے دوچار ہوں گے اور وہ سکون کے لئے ترستے رہیں گے اور دل کی دنیا میں ماتم برپا ہوگا اور چھوٹے

چھوٹے مسائل فرد کی زندگی کو زہرناک اور اذیتناک بنا دیں گے۔

ان اسباب اور رکاوٹوں کے باوجود مایوسی کی کوئی ضرورت نہیں، فرد کو حوصلہ وہمت سے کام لے کر خود احتسابی کے ذریعہ فطری صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے، فطرت میں اللہ سے والہانہ محبت کا داعیہ وتقاضا موجود ہے، اس کی بیداری سے رفتہ رفتہ یہ ساری رکاوٹیں دور ہوسکتی ہیں، اور فرد کے لئے اللہ کے ذکر ومراقبہ اور اس سے عشق کی راہیں ہموار ہوسکتی ہیں، بس اس کے لئے ماحول کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

اگر فرد ذکر وفکر سے دوری اور اس سے محرومی کے نتائج پر غور وفکر سے کام لے کہ اس سے دنیا کی یہ زندگی بھی زہر بن جاتی ہے تو آخرت کی زندگی تو شدید ترین عذاب سے دوچار ہوگی، اس استحضار سے بھی فرد کے لئے اس بحران سے نکلنے کی صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں، اور کسی حقیقی اہل اللہ تک رسائی ہوسکتی ہے، جس سے فرد کی ایک نئی پاکیزہ زندگی شروع ہوگی۔

تعلیم، علوم وفنوں اور معاشی سرگرمیوں کی ممانعت ہرگز نہیں، دنیا میں رہنا ہے تو ان چیزوں کے بغیر چارہ کار نہیں، لیکن یہ دنیاوی مصروفیات وسرگرمیاں اگر ذکر وفکر اور مخلصانہ عبادت کی قیمت پرہوں گی تو یہ بجائے خود مقصود ہوجائیں گی اور نفس، شیطان اور مادی قوتوں کے غلبہ کا ذریعہ بھی۔

ہمارے بزرگوں نے وقت کی جو تقسیم کی ہے، وہ اس طرح ہے، آٹھ گھنٹے روزگار کے لئے، آٹھ گھنٹے آرام کے لئے، آٹھ گھنٹے عبادت اور ذکر ومراقبہ کے لئے۔ وقت کی یہ تقسیم ایسی ہے، جس سے زندگی کے سارے معاملات حداعتدال میں رہتے ہیں، مادی ضروریات کی تکمیل کی صورت بھی پیدا ہوتی ہے، جسم کو آرام اور راحت بھی ملتی ہے تو عبادت وذکر وفکر سے فرد کی روح بھی مطمئن ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ باطنی بیماریوں سے نجات حاصل ہوکر، فرد نفس مطمئنہ کا حامل بھی ہوجاتا ہے۔ جب زندگی کا یہ توازن واعتدال باقی نہیں رہتا تو مادیت کا شیطان مسلط ہوکر، فرد وافرادِ معاشرہ کو فساد سے دوچار کر دیتا ہے اور دل کو دنیا کی حرص وہوس سے بھر دیتا ہے۔

قرآن کی تلاوت اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی یہ زندگی سراسر دھوکے اور فریب کی زندگی ہے، یہ زندگی کھیل وتماشہ سے زائد نہیں ہے، ساٹھ ستر سال کی یہ زندگی چندلمحات سے زیادہ نہیں۔ اتنی ناپائدار زندگی کے مستقبل کی فکر کا ہر وقت غالب ہونا، یہ اغوائے شیطانی واغوائے نفسانی ہے اور غیرمعمولی حجابات ہیں، جو فرد وافراد کی دنیا وآخرت کی زندگی کی تباہی کا موجب بنتے ہیں، جب دل کی آنکھیں بند ہوتی ہیں، آخرت آشنا کانوں پر پردے پڑجاتے ہیں، عقل پر مادیت اور دنیا کا بت سوار ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ تزکیہ، اصلاح نفس، محبوب حقیقی سے محبت اور ذکر وفکر ومراقبہ سے دوری کی صورت میں ہی ظاہر ہوتا ہے۔

وقت تیزی سے گذر رہا ہے اور مہلت عمر کم سے کم ہوتی جارہی ہے، عالمی سطح سے لے کر مسلم معاشرے کی سطح تک چھوٹے چھوٹے کروڑہا دجال پیدا ہو چکے ہیں، جو مادی حسن پر فدائیت کی تعلیم دے رہے ہیں ،دنیا کو مقصود بنانے کی روح پھونک رہے ہیں، اگر اب بھی بیدار نہ ہوئے تو پھر کب بیدار ہوں گے۔ اللہ کے ہاں اصل مطلوب چیز اللہ کی رضامندی کا احساس وجذبہ ہے، جو عشق ومحبت، ذکر وفکر، مخلصانہ عبادت واطاعت اور معاملات کی پاکیزگی وغیرہ سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اس کی دوسری کوئی صورت نہیں، ذکر وفکر اور مراقبہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے غلبہ کی وجہ سے اللہ کا رنگ غالب ہوتا ہے، دنیا کی پُر فریب زندگی کی حقیقت واصلیت کا راز کھلتا ہے، دنیا کا رعب، اس کی وحشت اور اس کی دھشت ختم ہوتی ہے، اللہ سے ملاقات کا شوق غالب ہوتا ہے، آخرت کی زندگی کل کی نہیں، آج کا مسئلہ بن جاتی ہے۔

جس ذکر ومراقبہ کے یہ فوائد وثمرات ہیں، اس سے دوری، اُس سے بیزاری، بلکہ اس سے وحشت کا ہونا سعادت دارین سے محروم ہونا ہے اور اپنے لئے بربادی خریدنا ہے، ماضی کی قومیں جن کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے، ان کی اصل بیماری اللہ کو بھلا دینے، آخرت کو فراموش کرنے اور دنیاوی زندگی کو محبوب ترین سمجھنے کی بیماری تھی، جس کی وجہ سے وہ اس دنیا میں بھی اللہ کے عذاب کا نشانہ بنے تو آخرت میں بھی وہ شدید عذاب کا شکار ہوں گے۔

ذکر کی سب سے بہتر شکل اسم ذات کے ذکر کی ہے، بالخصوص اسم ذات کے قلبی ذکر کی ہے، ایک حدیث شریف کے مطابق قلبی ذکر، جہری ذکر سے ستر گنا افضل ہے، اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اس سے اسم ذات یعنی اللہ کی ہستی میں موجود انوارحسن سے دل اور دماغ

دونوں پوری طرح فیضیاب ہوتے ہیں، اور اللہ کے دھیان کے غلبہ سے نفس کے زیادہ بہتر طور پر مہذب ہونے کی صورت پیدا ہوتی ہے، اس لئے فرمایا گیا **وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ** (اور اس شخص کی بات نہ مان جس کا دل ہمارے ذکر سے غافل ہے اور وہ خواہشات کا پیروکار ہے،) یعنی دل کا اللہ کے ذکر سے غفلت کا لازمی نتیجہ خواہشات نفس کے غلبہ کی صورت میں ہی ظاہر ہوتا ہے، دوسری آیت میں فرمایا گیا **أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ** (کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اللہ کے ذکر کے وقت اہل ایمان کی دلیں کانپ جائیں۔)

ذکر ومراقبہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمارے لئے دور جدید کی ساری نفسیاتی، اعصابی، ذہنی اور وجدانی بیماریوں سے بچانے کا ذریعہ ہے، (جو اس وقت لگ بھگ ہر فرد کا مسئلہ ہے) اس کا دوسرا اہم کردار یا خصوصیت یہ ہے کہ وہ نفس کی داخلی دنیا میں موجود باطل سے محاذ آرائی کرکے، اندر کے بت خانہ کو توڑ پھوڑ دیتا ہے، ذکر ومراقبہ کا تیسرا اہم کردار یہ ہے کہ اس سے خارجی باطل سے مقابلہ کی ہماری صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے، اور ہماری حمیت دین کی حس بیدار سے بیدار تر ہونے لگتی ہیں، ذکر ومراقبہ کا چوتھا کردار یہ ہے کہ قرآن وسنت میں موجود نور تک رسائی میں آسانی ہونے لگتی ہے اور قرآن کی ایسی نئ تشریحیں جو عقلیت، لغت اور استدلالِ محض کی بنیاد پر ہوتی ہیں، جن کا سلف صالحین کی قرآنی تشریح سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ہمارا دل قرآن کی اس طرح کی تشریحات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

اس کا پانچواں کردار یہ ہے کہ ہمیں باطنی طور پر وہ بصیرت حاصل ہوتی ہے، جو زندگی کے معاملات میں ہمارے لئے صحیح وغلط کے درمیاں فرق پیدا کرنے کی صلاحیت کا موجب ثابت ہوتی ہے۔ ذکر ومراقبہ کی کثرت کا چھٹا کردار یہ ہے کہ اس سے ہم زندگی بھر کے معاملات میں منفی سوچ سے بچ کر، مثبت سوچ کے حامل ہوجاتے ہیں، اور دل، زندگی کے ہر معاملہ کے منفی پہلو کو جھٹک کر مثبت پہلو کو غالب کرنے کا باعث بنتا ہے، ذکر ومراقبہ کی کثرت کا ساتواں کردار یہ ہے کہ اس سے ہم اللہ کی مخلوق کے لئے سراپا شفیق اور محبت بن جاتے ہیں، نیز ان کی کوتاہیوں کو دل کی گہرائیوں سے معاف کرنے کی صلاحیتوں کے حامل ہوجاتے ہیں۔ ذکر ومراقبہ کی کثرت کا آٹھواں کردار یہ ہے کہ اس سے اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونے میں حائل رکاوٹیں دور ہونے لگتی ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں حلاوت محسوس ہونے لگتی ہے۔

ذکر ومراقبہ کے یہ اور اس طرح کے فوائد وثمرات ایسے ہیں، جن کا ذکر ومراقبہ سے باہر رہ کر فہم وادراک ہونا ممکن نہیں۔

یاد رکھیں کہ یہ ہمارے کسی ایک یا کئی اعمال بد کی سزا ہوتی ہے، جو اس دنیا میں شدید ذہنی دباؤ کی صورت میں ہمیں ملتی ہے، آخرت میں اس سزا میں کئی سو گنا اضافہ ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ ہماری اس حالت زار پر رحم فرمائے۔

یہ نکتہ سمجھنا بھی از حد ضروری ہے کہ اپنی قابل ذکر حد تک اصلاح سے پہلے دوسروں کی اصلاح کے پیچھے پڑجانا، ایسے ہے، جیسے اپنے جسم پر بیٹھے ہوئے سانپ اور بچھوں کی فکر کی بجائے دوسروں کے جسم پر بیٹھی ہوئی مکھیوں کی فکر کرنا، یہ سراسر نادانی ہے، اور نفسی قوتوں اور شیطان کے اغویٰ کا نتیجہ ہے، جب فرد اپنے نفس کے تزکیہ کے مراحل سے گذرنے میں ناکام ہوگا تو وہ دوسروں کی اصلاح کیسے کر سکے گا؟

حقیقت یہ ہے کہ باطن کی باطل قوتیں ایسی خوفناک ہیں کہ وہ فرد کو عام طور پر دوسروں کی فکر میں مصروف رکھکر ، اپنی فکر سے آزاد کر لیتی ہیں، جو سب سے بڑے خسارہ کا سودہ ہے۔ جب فرد تزکیہ کی راہ پر گامزن ہوتا ہے تو اس کے نفس کے اندر موجود گندگی کے ڈھیر نکلنے لگتے ہیں اور اسے نفس کے بہت بڑے بڑے بت خانہ سے واسطہ پڑتا ہے، وہ یہ دیکھکر حیرت زدہ ہوتا ہے کہ اگر اس پر اللہ کا فضل خاص نہ ہوتا تو وہ نفس کے داخلی بتوں کی پوجا کے وجہ سے جہنم کا ایندھن بنتا اس لئے تزکیہ نفس کے حوالے سے سخت فکرمندی اور بے تابی کی ضرورت ہے۔

(۳)

اس قت ہم بہت سارے مسائل کا شکار ہیں، جو ہمارے لئے موت وزندگی کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، ان مسائل میں اداسی، احساس تنائی، بے چینی وبے قراری کا مسئلہ، نئ نئ

پریشانیوں اور مصائب کے زیر تلے دب جانے کا مسئلہ ، احساسات کی شدت کا مسئلہ ، عزیز واقارب اور دوست واحباب کی طرف سے مسلسل اذیت رسانی کا مسئلہ، صبر وشکر ، تحمل وبردباری کے فقدان کا مسئلہ ، دنیا کے حوالے سے نہ ختم ہونے والی فکرمندی کا مسئلہ ، گھر میں چھوٹے چھوٹے مسائل پر جھگڑنے کا مسئلہ ، زندگی کے لگ بھگ سارے مسائل میں خوداعتمادی کے بحران کا مسئلہ ، اپنوں کی طرف سے محبت، رواداری، ہمدردی ، حوصلہ افزائی اور تعاون نہ ہونے کا مسئلہ ، اپنے قریب ساتھیوں کی طرف سے ایذا پہنچانے کا مسئلہ ، شادی جیسی بنیادی ضرورت کے معاملہ کا پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوجانے کا مسئلہ ، مالی طور پر خوشحال افراد کا اپنے غریب عزیز واقارب کو ان کی حالت زار پر چھوڑ دینے کا مسئلہ ، ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کا مسئلہ ، ایک دوسرے کے کام نہ آنے کا مسئلہ، زیادہ سے زیادہ بولنے اور بڑی بڑی باتیں کرنے اور عمل کے معاملہ میں سب سے پیچھے رہ جانے کا مسئلہ ، معاملات کے مثبت پہلوؤں کی بجائے منفی پہلوؤں کے غالب ہوجانے کا مسئلہ ، اپنے آپ کو سب سے زیادہ قابل رحم سمجھنے کا مسئلہ ، وفاداری کے خاتمہ کا مسئلہ ، باطن اور لاشعور کی طرف سے آنے والے ان گنت وسوسوں کا مسئلہ، معاشی اعتبار سے بہتر حالت ہونے کے باوجود احساس محرومی کے شکار ہونے کا مسئلہ ، مادی دنیا اور مستقبل کے حوالے سے ان گنت تفکرات اور لاحق خطرات کا مسئلہ ، بڑا گھر ہونے کے باوجود احساس تنہائی کے غالب ہونے کا مسئلہ ، خوشحال خاندانوں سے وابستہ افراد کا اخلاقی جرائم میں مبتلا ہونے کا مسئلہ، آخرت کی ابدالاباد زندگی کو مکمل طور پر بھلا دینے کا مسئلہ، دوسروں کے حالات ومسائل سے بے نیاز ہوکر، اپنے ذاتی مسائل اور ذاتی پریشانیوں کو موت وحیات کی حیثیت دینے کا مسئلہ ، آئے دن نئے نئے بحرانوں سے دوچار ہوجانے کا مسئلہ ، گھروں میں تلخ کلامی اور کشیدگی کا مسئلہ ، اللہ کی طرف سے حاصل نعمتوں کی شکر کی عدم ادائیگی کا مسئلہ ، دوسروں سے بہت زیادہ شکایات کے ہوجانے کا مسئلہ ، محلّہ کے مسائل سے آخری حد تک عدم دلچسپی کا مسئلہ ، چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اپنے وقار اور عزت کا مسئلہ بنانا اور خود احتسابی سے کام نہ لینے کا مسئلہ ۔

غرض کہ یہ اور اس طرح کے سینکڑوں مسائل ہیں، جن میں ہم میں سے لگ بھگ ہر فرد کسی نہ کسی حد تک مبتلا ہے، غریبوں کے مقابلہ میں مالدار افراد ان مسائل میں زیادہ شدت سے مبتلا ہیں، اس اعتبار سے ان کی زندگی زیادہ اذیتناک ہے، اس لئے کہ بڑے پن اور شان مان کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان کے احساسات زیادہ شدید ہوجاتے ہیں ہم ان مسائل میں کیوں مبتلا ہیں، جب کہ ہمارے آباؤ اجداد عام طور پر غربت کے حالات میں مبتلا ہونے کے باوجود صبر وشکر، توکل وقناعت وسادگی کے ساتھ رہ کر خوشی وسکون سے زندگی سے رخصت ہونے میں کامیاب ہوئے، اس اعتبار سے ہماری محرومی پر ساری کائنات اور اللہ کی دوسری ساری مخلوق ماتم کناں ہے۔

یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر سنجیدگی اور انتہائی سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ مسائل اور ان کی احساس شدت یہ دراصل ہماری اپنی ہی پیدا کردہ چیزیں ہیں، یہ دوسروں کی مسلط کردہ نہیں ہیں، اس اعتبار سے ہم اپنے ہی پیدا کردہ مسائل کی آگ میں جل رہے ہیں، اللہ کے لئے ہمیں اپنی حالت زار پر رحم کرنا چاہئے اور خوداحتسابی سے کام لیکر ہمیں جائزہ لینا چاہئے کہ ہم مسائل کے ان بحرانوں سے نکل کر، کس طرح انسانیت کے شایانِ شان زندگی گزار سکتے ہیں۔

ہماری نظر میں ہمارے پیدا کردہ یہ سارے مسائل مغرب کے مادہ پرست انسان کی تقلید کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، مغرب نے مذہب کو اپنی زندگی سے نکال دیا ہے، مغرب، روحانیت سے انکار کی راہ پر گامزن ہے۔ مغرب نے مادیت پرستی کی زندگی کو مقصود کی حیثیت دی ہے، مغرب نے خدا ،آخرت اور پاکیزہ اخلاقی قدروں سے بے نیازی اختیار کرلی ہے، مغرب نے دل کی اہمیت سے صرف نظر کیا ہے، مغرب نے ذکر کو غیرضروری قرار دیا ہے، اس طرح مغرب نے اپنے افراد کو عملی طور پر جہنم کے کنارے پر لاکھڑا کیا ہے، مغرب کی تقلید میں ہم بھی اسی راہ پر گامزن ہیں، اس کے نتائج ہیں کہ ہماری زندگی زہرناک ہوگئی ہے، بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ مغرب کی یہ تقلید ہمارے مزاج کا حصہ بن گئی ہے، ہم کسی بھی صورت میں مغرب کی اس تقلید سے نکلنے کے لئے تیارنہیں، اس لئے کہ ہمارا نظام تعلیم، مغرب ہی سے ماخوذ ہے، جو بچپن سے انہی خطوط پر افراد کی ذہن سازی اور سیرت سازی کی تعمیر کا ’’کارنامہ‘‘ سرانجام دیتا ہے، اس کا نتیجہ ڈپریشن، زندگی سے بیزاری، احساسات کی شدت، صبروشکر کی کمی اور مادی زندگی کو حسین سے حسین تر بنانے کے علاوہ کوئی دوسرا نکل ہی نہیں

سکتا۔

مغرب نے خدا اور مذہب سے صرف نظر کرکے، عقلیت کو بنیاد بنا کر یقیناً مادی ترقی کی ہے اور اپنے سیاسی، سماجی اور شہری نظام کو بہتر بنانے اور لوگوں کے مسائل کے حل میں کامیابی حاصل کر لی ہے، ان کے اجتماعی ریاستی نظام میں بہت بہتری پیدا ہوئی ہے، جب کہ ہم اس اعتبار سے بھی ناکام ہیں۔ اور مغرب کے مقلد سیاستدان اور افسران نے اس اعتبار سے مغرب سے سیکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی، وہ ذاتی مفادات اور لوٹ مار سے ملت کو تباہ کرتے رہے ہیں، مغرب کی اس مادی ترقی اور اس مثبت پہلو کے باوجود سوال یہ ہے کہ مغرب کی طرف سے مذہب کو مسترد کرنے کے بعد کیا ان کے ہاں باہمی محبت ورواداری میں اضافہ ہوا ہے یا کمی ہوئی ہے؟ ان کے افراد میں شفقت اور رحمت کے جذبات میں ترقی ہوئی ہے یا وہ جذبات بالکل ختم ہوگئے ہیں، کیا ان کے ہاں خاندانی نظام کا تقدس قائم ہوا ہے یا وہ ختم ہوا ہے، کیا ان کے ہاں ڈپریشن اور نفسیاتی بیماریوں اور خود اعتمادی کے بحران میں کمی آئی ہے یا اس میں غیرمعمولی اضافہ ہوا ہے، کیا ان کے ہاں طلاق کی شرح میں کمی آئی ہے یا اس میں ہولناک حد تک اضافہ ہوا ہے، کیا ان کے ہاں جنسی جرائم اور جبری جنسی عمل میں کمی آئی ہے یا وہ اپنی انتہا کو پہنچاہے، کیا معاشی خوشحالی کے باوجود ان کے ہاں خودکشی کے ریشہ میں کمی آئی ہے یا اس میں ہولناک حدتک اضافہ ہوا ہے۔

جب ان ساری چیزوں میں مغرب تیزی سے زوال پذیر ہے اور اللہ کے سخت عتاب کا شکار ہے تو ہم ان معاملات میں مغرب کی تقلید اختیار کرکے، اللہ کے عتاب سے کس طرح بچ سکتے ہیں، سوچنے کی ضرورت ہے، اور مزید سوچنے کی ضرورت ہے اور بار بار سوچ کر اپنے طرزعمل میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

علامہ ابن حزم نے آج سے لگ بھگ ایک ہزار سال پہلے لکھا تھا کہ جہاں حقیقی مذہب نہ ہوگا، وہاں انسان سانپ، بچھو اور درندہ بن جائے گا، جو ایک دوسرے کو ڈستے رہیں گے اور چیر پھاڑیں گے۔

علامہ ابن حزم کے بیان کردہ اس نکتہ کو دیکھیں اور آج انسانیت کا جائزہ لیں تو یہ بات سو فیصد صحیح نظر آئے گی، آج قتل وغارتگری اور سنگ دلی کے معاملہ میں انسانیت بہت آگے چلی گئی ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو شدید اذیت پہنچانے، انتقام لینے، بلکہ مار ڈالنے تک کے واقعات ہوتے ہیں، دنیا میں ہر سال لاکھوں افراد کو قتل کیا جارہا ہے۔

یہ سب خدا اور مذہب کو فراموش کرنے ہی کا نتیجہ ہے کہ انسان درندگی کی انتہائی حدود تک پہنچ گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ سچی مذہبی زندگی کیسے پیدا ہوگی، جس سے ہم سارے مسائل وبحرانوں سے نکل کر اللہ کی آخرت کی جنت سے پہلے اس کی اس دنیا کے جنت میں داخل ہوں، جسے قرآن نے حیٰوۃ طیبہ قرار دیا ہے۔

قرآن میں ایک جگہ ہے :

ولو ان اهل القریٰ امنوا والتقوا لفتحنا علیهم برکاة السماء والارض . (اگر یہ دیہاتی ایمان لاتے اورتقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کے لئے زمین وآسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے)۔

دوسری جگہ ہے:

للذین احسنوا فی هذاه الدنیا حسنه ولدار الاخرة خیر (نیکوکاروں کے لئے یہ زندگی بھی بہتر ہے اور آخرت کی زندگی تو مزید بہتر ہوگی)۔

قرآن میں اس طرح کی کئی آیتیں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ مومن خود اس دنیا میں خوف وحزن سے محفوظ ہوجاتا ہے اور اللہ اسے ہر طرح کے حالات میں سکینت اور حالت خوشی میں رکھتا ہے۔ خوف وحزن کی زندگی دراصل جہنمی زندگی کا عکس ہے، جو فرد وافراد کی زندگی کو اندر سے دیمک کی طرح چاٹ دیتی ہے۔

خوف وحراس اور خوف وحزن کے دیو سے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم سچی مذہبی زندگی اختیار کریں، اللہ سے لو لگائیں، اس سے محبت کا تعلق مستحکم کریں، اللہ سے مانگنے کی نفسیات پیدا کریں، ہرمشکل کے حل کے لئے اسی سے مانگیں، اللہ کے ذکر سے دل کو منور اور شاداب کرنے کی کوشش کریں، اہل اللہ سے اپنے تعلق کو مستحکم کریں، اس لئے کہ اہل اللہ کثرت ذکر اور مخلصانہ عبادت کی وجہ سے ہر وقت سکون وسکینت اور خوشی وحلاوت کی حالت میں رہتے ہیں، دنیا کا بڑے سے بڑا مسئلہ بھی انہیں خوف وحزن اور خوف وہراس میں مبتلا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا، وہ اپنے اندر ذکر کا وافر ذخیرہ رکھتے ہیں، ان سے تعلق کے

نتیجہ میں یہ ساری پاکیزہ چیزیں ان کے دل سے منتقل ہوکر، دلوں میں داخل ہونا شروع ہوجاتی ہیں، ذکر کے لئے ذوق وشوق کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، نیز اللہ کی محبت کی راہ میں چلنا آسان ہوتا ہے، ذکر کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور ہوتی ہیں، مادیت پرستی کے ماحول، شیطان اورنفسی قوتوں سے بتدریج نجات ملنے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

حوصلہ اور ہمت سے کام لے کر راہ محبت میں چلنے کی ضرورت ہے، زندگی نام ہی حوصلہ وہمت سے کام لینے کا ہے، ہمت ہارنے یا ہمت کا مظاہرہ نہ کرنے اور اہل اللہ سے رابطہ مستحکم نہ کرنے کا لازمی نتیجہ جو ظاہر ہوگا، وہ یہ ہے کہ دجال کوظہور میں لانے والے کروڑہا کی تعداد میں پیدا ہونے والے چھوٹے چھوٹے دجال جو موبائل، نیٹ اور فیس بک پر ظاہر ہوچکے ہیں اورعملی زندگی میں سامنے آچکے ہیں، فرد وافراد ان کی زد میں آئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ فضا اور ماحول میں جو بے پناہ ظلمات پیدا ہوچکی ہے، جس کی وجہ سے اداسی، زندگی سے بیزاری، بڑھتا ہوا ذہنی دباؤ ، اورسکون کے خاتمہ نے جنم لیا ہے، ان سب کا علاج اہل اللہ کی صحبت اور ان سے رابطہ ہی ہے، جس سے قلب میں انوار کی منتقلی کاعمل جاری ہوگا، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی فرد کو چھوٹے چھوٹے مسائل پہاڑ جیسے مسائل نظر آنے لگتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی سمجھنا چاہئے کہ جب ذکر اور اعمال صالحہ میں سستی اورغفلت کا مظاہرہ ہوتا ہے تو پھر فرد کے ساتھ اللہ کا ایک اہم اصول لاگو ہوجاتا ہے، وہ اصول یہ ہے کہ اللہ، فرد اور اس کے دل کے درمیاں حائل ہوجاتا ہے، **(ان اللہ یحول بین المرء وقلبه)**

کوشش کرنی چاہئے کہ ذکر اور اعمال سے غفلت کی نوبت نہ آئے پائے، ورنہ اللہ کے حائل ہونے کے بعد دل میں حجابات مستحکم ہوجاتے ہیں اورکوشش کے باوجود ذکر واعمال کے لئے آمادگی پیدا نہیں ہوتی، جس سے فرد نئے نئے مسائل اور پریشانیوں سے دوچار ہونے لگتا ہے، بلکہ اس کی دنیاوی زندگی قیامت خیز حالات سے دوچار ہونے لگتی ہے۔حجابات کی دوری کے سلسلہ میں بھی صحبت ورابطہ مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ یاد رکھئے کہ آخرت کی پلطراط تلوار سے زیادہ تیز ہے، اس پلصراط کے ایک طرف جہنم ہے تو دوسری طرف جنت ہے، یہی حال نفس کی پلصراط کا ہے کہ اس پر گزرنے سے نفس کے ہزارہا مکر وفریب سامنے آتے رہتے ہیں، نفس کی پلصراط کے ایک طرف نفس امارہ ہے تو دوسری طرف نفس مطمئنہ ہے، نفس امارہ سے گزر کر نفس مطمئنہ تک پہنچنا گویا آخرت کی پلصراط سے گذرنا ہے، نفس کی پلصراط سے گزرے بغیر چارہ کارنہیں ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر نہ تو اللہ تک رسائی ممکن ہے اور نہ ہی آخرت کی پلصراط سے گزرنا آسان ہے، نفس کی پلطراط نہایت نازک اور دشوار تر ہے، ہمیں دنیا کے مسائل نے اتنا گھیراؤ ہوا ہے کہ آخرت کی پلصراط کی ہمیں کوئی فکر لاحق نہیں ہے، دنیا کے سنگین مسائل ہوں یا آخرت کی پلصراط کا نازک ترین مسئلہ، یہ دراصل نفس کی پلصراط کا معرکہ طے کئے بغیر ہمارے لئے آسان نہیں ہے، اس لئے کہ نفس، حب جاہ، حب مال، حرص وہوس اور دوسروں پر فوقیت وبرتری چاہتا ہے، نفس کے مادی جذبات کی ایک وسیع ترین دنیا ہے، نفس وسیع ترین سمندر کے مثال ہے، جہاں ہزاروں ٹن کی خوفناک اور طاقتور مچھلیاں رہتی ہیں، جن کے ایک پَر کے ہلانے سے فردوافراد کی زندگیوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے، اتنے طاقتور نفس کا مقابلہ اسی وقت ہوسکتا ہے، جب فرد نفس کی وسیع ترین دنیا کی تہذیب کے مسئلہ کو اولین اور فیصلہ کن اہمیت دیتا ہو اور اس راہ میں حائل ساری رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے اپنی بیشتر توانائیوں کے استعمال کے لئے تیار ہو۔

نفس کی داخلی دنیا سے ہر وقت نئے نئے طاقتور فرعون نمودار ہوتے رہتے ہیں، جو انا ربکم الاعلیٰ کے دعویدار ہوتے ہیں اور جو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو مقابلہ کا چیلنج دیتے رہے ہیں۔نفس کی اس خوفناک قوت کو سمجھکر ہمیں اس سے نمٹنے کے لئے بہتر سے بہتر حکمت عملی تشکیل دینی ہے، دوسری صورت میں آخرت کی پلصراط سے گزرنے میں ناکامی کا خطرہ درپیش ہے، نفس کی وسیع تر قوت اللہ کے کثرت ذکر کے نور کے بغیر نہ تو مطیع ہوسکتی ہے اور نہ ہی وہ روزمرہ زندگی میں اپنی شرارتوں سے باز آسکتی ہے، نفسی قوتوں کو مفتوح کئے بغیر سکون قلبی کی دولت عظمیٰ کا حاصل ہونا بھی مشکل ترین عمل ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین صورت میں تخلیق کیا ہے، لیکن نفسی قوت اسے پست سے پست تر حالت میں گرانا چاہتی ہے، اس طرح نفس اسے دنیا وآخرت دونوں جہانوں میں ناکامی سے دوچار کرنا چاہتا ہے اور اللہ کے عتاب کا نشانہ بنانا چاہتا ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نفس کی قوت انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے، اس دشمن سے مقابلہ کے لئے حوصلہ وہمت اور ساری قوتوں کے استعمال کی

ضرورت لاحق ہے، اس کے بعد کہیں جا کر ہی یہ دنیا اور آخرت کی دنیا جنت کا منظر بن سکتی ہے، نفسی قوتوں کے غلبہ کی صورت میں دنیا وآخرت میں نجات، کامیابی اور خوشی وحلاوت کی زندگی کی امید رکھنا عبث ہے۔

ہماری حالت یہ ہے کہ ہم دنیا کے چند روزہ مسائل میں الجھے رہتے ہیں، جب کہ قرآن انتباہ دیتا ہے کہ جہنم تمہاری گھات میں ہے، قرآن میں ایک دوسری جگہ ہے کہ اللہ تمہاری گھات میں ہے۔

جب جہنم اور اللہ فرد وافراد کی گھات میں ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فرد وافراد کی مستقبل کی زندگی سخت خطرات کی زد میں ہے، ان خطرات سے بچاؤ کی فکر اور تیاری کا ہونا ہی سب سے بڑی دانشمندی ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ یہ سارے معرکے طے کرنے کے لئے کثرت ذکر اور اہل اللہ کی صحبت ناگزیر ہے، ذکر اور صحبت، نفس کی قوت کو پگھلانے اور اسے مضمحل کرکے، اسے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں دینے کا موجب بنتے ہیں، نفسی قوتوں کے معرکہ کو طے کرنا فرد کے اپنے بس کی بات نہیں ہے، اس کے لئے اللہ کا فضل خاص چاہئے، جو کثرت ذکر اور صحبت اہل اللہ سے ہی وابستہ ہے، امت نے اپنی ساری تاریخ میں نفس کے معرکہ کو طے کرنے کے لئے یہی دونوں طریقے اختیار کئے ہیں، اور اسی سے نفس کی تہذیب کا عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے اور انسانی جوہروں سے بہرہ وری ہوتی ہے اور فرد وافراد کے لئے دنیا کے ہر طرح کے بحرانوں سے عہدہ برآ ہونے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

نفس کی پلصراط طے ہونے کی علامت ایک ہی ہے اور وہ ہے اسلامی شریعت کی ظاہری اور باطنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی صلاحیت کا پیدا ہونا۔ جب تک یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، اس وقت تک ذکر وفکر کے مجاہدوں کا عمل جاری ہوگا،اور صحبت ورابطہ کا خصوصی اہتمام بھی۔ اس لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ نفس کی فنائیت کے عمل کے طے ہونے سے پہلے صحبت ورابطہ کے سلسلہ کو منقطع کرنے سے فرد دینی اور روحانی طور پر گرنا شروع ہوجائے گا، اور اس کی اصلاح کا عمل بُری طرح متاثر ہوگا۔

یہ بہت اہم اور قابل غور بات ہے کہ آخرت کی یاد دہانی، اللہ سے ملاقات، راہ محبت، اور ذکر وفکر وروحانیت کے حوالے سے ہونے والی باتیں عام طور پر ہم پر اثر انداز کیوں نہیں ہوتی؟ آخر ایسا کیوں ہے کہ ہم یہ باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں اور ہمارا دل ان باتوں کے اثرات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا؟ اس سوال پر بہت زیادہ غور وفکر کی ضرورت ہے۔

ہماری نظر میں اس کا اہم سبب یہ ہے کہ ہمارا گھر کا ماحول جس میں ٹی وی، موبائل، فیس بک وغیرہ کو فیصلہ اہمیت حاصل ہے، وہ صحیح نہیں ، وہ ہر وقت مسموم اثرات ہمارے دل وذہن میں ڈالنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ دوم یہ کہ سکول وکالیج کا ماحول جس سے ہمارا گہرا واسطہ ہے ،وہ مادیت پرستی پر مبنی ہوتا ہے، ہمارے لاشعور میں اس کے گہرے اثرات موجود ہوتے ہیں، سوم یہ کہ ہمارے ساتھیوں کا ماحول ایسا ہوتا ہے، جن کا دل اللہ کی محبت سے ناآشنا ہوتا ہے، اور جن کے دل پر نفس کی گرفت مستحکم ہوتی ہے، ان تین قسم کے ماحول کے اثرات کی وجہ سے ہمارے دل میں اللہ کی محبت، ذکر وفکر اور آخرت کے حوالے سے گفتگو کو قبول کرنے کی صلاحیت کمزور اور مسدود ہوجاتی ہیں۔

یہ تینوں قسم کے ماحول ہی ہیں، جن افراد کا یہ تینوں قسم کا ماحول پاکیزہ ہوتا ہے، ان کے لئے اللہ کی محبت اور راہ سلوک وذکر میں چلنا آسان ہوتا ہے اور مادیت اور نفس کی رکاوٹوں کو عبور کرنا زیادہ دشوار نہیں ہوتا، نیز اللہ کے ذکر، آخرت کی یاددہانی اور اللہ سے ملاقات کی باتوں سے ان کی رقت وخشیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ماحول کے ان مسموم اثرات سے بچالے اور ہمیں ابدالا باد والی زندگی میں اپنے عذاب وعتاب سے بچالے۔